عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

جلوری ۱۹۳۲ء

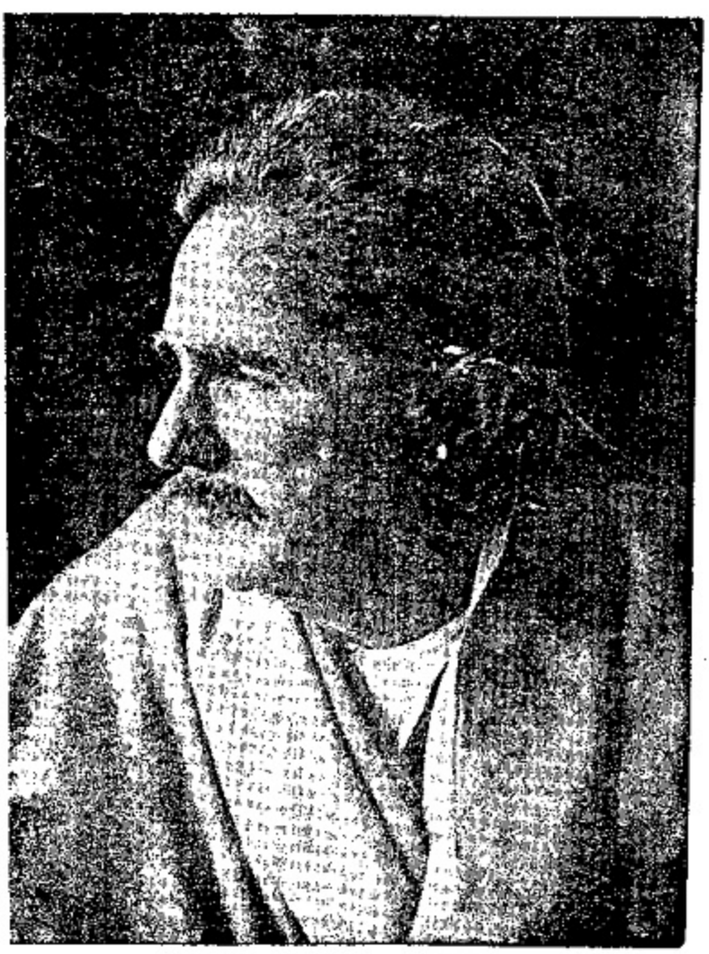

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتّب
اخوندزادہ حسین امام

بدلِ اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ
ششماہی
تین روپیہ
قیمت فی پرچہ
آٹھ آنے

جلد (۵) شمارہ (۱)

ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

فہرستِ مضامین

لمعات	ادارہ	۱ — ۸
ہمارا جرم	"	۹ - ۲۳
توجہ طلب		۲۴
دنیا کی نجات	جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۲۵ — ۳۸
؟		۳۹ - ۴۰
شاہ سیّد احمد صاحب شہیدؒ کی سیرت پر ایک اجمالی نظر	جناب ضیاء الدین صاحب بی۔ اے	۴۱ - ۵۴
نقد و نظر	ادارہ	۵۵ - ۵۷
عید الضحٰے	جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۵۸ - ۶۲
		۶۳ - ۶۴

لمعات

یوں تو وہ کونسا وقت ہے جب انسان کے "ظلوم وجہول" ہونے کی داستانیں ہمارے سامنے نہیں آتیں - لیکن پچھلے دِنوں جو کچھ بنگال میں ہُوا ہے اُس کی نظیر بھی بمشکل کہیں ملے گی - حماقت اور اتنی بڑی حماقت ! غداری اور ایسی کھلی غداری کہ جس سے میر جعفر کی روح بھی شرمائے - آپ کہیں گے اسے حماقت کیوں کہا جائے - یہ تو انتہائی منافقت تھی - اس میں شبہ نہیں کہ منافقت بھی بہت بڑی تھی لیکن منافقت کا اس قدر "چلمنی نقاب" حماقت کا آئینہ دار نہیں تو اور کیا ہے - لیگ کے آئین وضوابط کے خلاف برملا سرکشی اختیار کی جاتی ہے اور ساتھ ہی اعلان پر اعلان کیا جا رہا ہے کہ میں لیگ کا بہت بڑا وفا شعار رکن ہوں - رُکن ہی نہیں بلکہ ہرکولیس ہوں جس کے سر پر لیگ کی ساری دُنیا قائم ہے - ایسی منافقت اگر حماقت نہیں تو اور کیا ہے ؟ اور جب منافقت کی آمیزش حماقت سے ہو تو وہ اگر خدا کے ہاں مردود ہوتی ہے تو شیطان کے ہاں بھی مقبول نہیں ہُوا کرتی - ایسے لوگوں کی دُنیا اور عاقبت دونوں خراب ہوتی ہیں - این سو راندہ و آں سو درماندہ - خسر الدُّنیا وَالْاٰخِرَۃ اسلئے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بھان متی کا کنبہ جس سے بنگال کی نئی وزارت کی تشکیل ہوئی ہے امن وسلامتی سے قائم رہ سکے گا ؟ ذرا سوچئے کہ ان سب میں قدر مشترک کیا ہے ؟ ہندوؤں کے دِل میں مسلم لیگ کی اجتماعیت اور وقار کی مخالفت کا جذبہ اور جناب فضل الحق صاحب کے دل میں لیلائے وزارت کا ہوس! نہ اُن کے سامنے انسانیت کا کوئی بلند مقصد نہ ان کا کوئی دین اور ایمان - پہلا سودا تو ٹھیک ہو گیا اُنہوں نے اِنھیں وزیر اعظم بنا دیا اور اِنہوں نے قوم کو اُن کے ہاتھوں فروخت کر دیا - اب سوال یہ ہے کہ اس کے بعد کیا ؟ وہ کونسا مسئلہ ہے جو بنگال اسمبلی میں پیش ہوگا اور اس میں مسٹر شیام پرشاد مکرجی (قائم مقام صدر ہندو مہاسبھا) - اور جناب فضل الحق (ایمانداری سے) متفق ہوں گے - اِن سب کو اپنے اپنے اصولِ دیانت تیاگ دینے پڑیں گے، ورنہ جوتیوں میں دال بٹا کریگی - فرمائیے کہ اس قسم کی ناؤ کیسے پار لگ سکتی ہے ! لیکن ناؤ کا جو حشر ہونا ہے سو ہو - ہندو بہرحال فائدے میں رہا - ناؤ ڈوبے گی تو فضل الحق کی وزارت کا خاتمہ ہوگا لیکن مسلمانوں میں تشتت پیدا کرنے کا جو مقصد ہندو کے

پیشِ نظر تھا وہ تو بہر حال حاصل ہو جائے گا۔ کوئی جناب فضل الحق صاحب سے پوچھے کہ ذرا سوچیے تو سہی کہ آپ نے کہاں سے رشتہ توڑا ہے اور کہاں جا کر جوڑا ہے؟ کعبہ کی چھت سے نکل کر تنکدہ کی دیوار کے سایہ تلے جا بیٹھنا! اللہ اکبر

ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی !

اور یہ سب کس لئے؟ چند دنوں کی ہوسِ جاہ پرستی کی تسکین کی خاطر!! سوچیے کہ بالآخر کتنے دنوں اس دُنیا میں جینا ہے! اگر اس پر زبانی ایمان نہیں بلکہ سچ مچ کا قلبی ایمان موجود ہے کہ ایک دِن خدا کے ہاں جانا ہے تو سوچو کہ وہاں کیا مُنہ دکھایا جائے گا سوچو کہ وہاں ایک طرف لوائے محمد عربیؐ ..... کے نیچے اُمتِ مسلمہ کا اجتماع ہوگا اور دوسری طرف میر جعفر کے جھنڈے کے نیچے غدارانِ ملّت کا انبوہ۔ نگاہیں زمین میں گڑی ہوں گی، طوقِ لعنت گردن میں، غدّاری کی داستان ماتھے پر لکھی ہوئی، جہنّم کے شعلے دِل کو لپٹے ہوئے۔ وہاں یہ وزارت کا طمطراق کس کام آئے گا؟ یہ تو وہاں کی کیفیت ہوگی۔ اور جتنے دِنوں یہاں جینا ہوگا۔ کس قدر ذلّت کا جینا ہوگا البتہ چند پیسے ضرور مِل جائیں گے! لیکن وہ بھی کس کے لئے؟ شاید اولاد کی خاطر۔ لیکن اولاد کی خود یہ حالت ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو ایسے باپ کی طرف منسوب کرتے ہوئے شرمائے گی۔ میر جعفر کی اولاد آج منہ چھپاتی پھرتی ہوگی کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ یہ اس ننگِ ملّت، ننگِ دین، ننگِ وطن کی اولاد میں سے ہیں۔ اپنی دُنیا تباہ کی، آخرت خراب کی۔ اور اولاد کے لئے ابدالآباد تک کلنک کا ٹیکا چھوڑ گئے۔ یہ ہے ماحصل اس تمام تگ و تاز کا جس کی کامیابی پر آج پھولے نہیں سماتے۔ انسان فی الواقعہ بڑا "ظلوم و جہول" ہے۔

جناب فضل الحق سے کہیں زیادہ افسوسناک حالت نواب صاحب ڈھاکہ کی ہے۔ یہ مسلم لیگ پارٹی کے ساتھ تھے لیکن جب پارٹی نے سر ناظم الدین کو اپنا لیڈر منتخب کر لیا تو جوشِ غضب میں ان کا خون کھول گیا، اور مغلوب الغضب ہو کر جو زبان پر آیا کہہ دیا، اعلان کر دیا کہ چونکہ سر ناظم الدین کانگریس والوں سے ساز باز کر رہے ہیں اور یہ چیز لیگ کے آئین کے خلاف ہے اس لئے میں اسے برداشت نہیں کر سکتا! چنانچہ ایک آدھ دن کیفیت رہی کہ جہاں لوگ ایک طرف نواب صاحب کی لیگ پارٹی سے علیحدگی پر چیں بجبیں تھے، دوسری طرف ان کی اس "اصول پروری" کی داد دیئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ لیکن تیسرے ہی دِن اس اصول پروری کا بھانڈا

پھوٹ گیا جب نواب صاحب کو دیکھا کہ فضل الحق صاحب اور مسٹر مکرجی کی گود میں بیٹھے ہیں۔ یہ ہیں ہمارے لیڈر جنہیں بات بنانی بھی تو نہیں آتی۔

ہرچند یہ واقعہ اس اعتبار سے افسوسناک ضرور ہے کہ ہم نے یہ نہ سمجھا کہ:-

دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہوجائے گا

لیکن کچھ ایسا تشویش انگیز نہیں جتنا اس ہنگامی اثر کے ماتحت عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ مسلم لیگ کی عظمت وزارتوں سے وابستہ نہیں بلکہ اس اصول سے پیوستہ ہے جس کی وہ علمبردار ہے۔ اور وہ اصول اپنی صداقت کی بنا پر اب عام مسلمانوں کے دل میں گھر کر چکا ہے۔ فضل الحق صاحب اگر آج لیگ کے ساتھ نہیں ہیں تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ بنگال کے مسلمان بھی لیگ کے ساتھ نہیں۔ فضل الحق صاحب بھی خوب جانتے ہیں اور ساری دُنیا پہچانتی ہے کہ یہ سب ہنگامہ آرائی اور رسّہ کشی محض اس لئے ہے کہ جنگ کی وجہ سے عام الیکشن ملتوی ہو چکے ہیں ورنہ اگر آج انتخابِ عامّہ کے ذریعہ سے نمائندوں کو چُنا جائے تو پھر دیکھئے کہ فضل الحق صاحب اور نواب صاحب ڈھاکہ کہاں نظر آتے ہیں۔ لیگ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکی ہے اور اس قسم کے حوادث وقتی طور پر کچھ ہلچل پیدا کر دیں تو کردیں، لیگ کو نقصان کچھ نہیں پہنچا سکتے۔ دراصل جناب فضل الحق اور ان جیسے اور حضرات کی اس قسم کی حرکات اُس حسد کی بنا پر ہیں، جو جناب جناح کی مقبولیت کی وجہ سے اُن کے دلوں میں پیدا ہو چکا ہے۔ حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ مسٹر جناح کی مقبولیت کا راز ان کے خلوص اور ایثار میں ہے۔ اگر یہی چیز ان میں پیدا ہو جائے تو یہ بھی جناح بن سکتے ہیں۔ مسٹر جناح کا تدبر، خلوص اور کیرکٹر کی بلندی تو ایسے مسلّمات ہیں جن کا دشمن تک کو اعتراف ہے۔..........

...... یہ اعتراف ہم اس سے پیشتر کئی مرتبہ کٹر کانگریسی لیڈروں کی زبان سے سُن چکے ہیں۔ حال میں مسٹر آرتھر مور (مدیر اسٹیٹسمین) نے اپنے مشہور مقالہ "ہماری جنگ" کے سلسلہ میں مسٹر جناح کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ہر صاحبِ بصیرت کے لئے حقیقت کشا شہادت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آخر اس کا راز کیا ہے کہ کل تک مسٹر جناح محض مسٹر جناح تھے۔ لیکن آج وہ مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا ہیں؟ اس سوال کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

"اس کا جواب ہم سب کے لئے (اور خود کانگریس کے لئے بھی) بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بشرطیکہ

ہم اس کا صحیح جواب معلوم کرسکیں۔" (اسٹیٹسمین ۲۳ ۱۱/۴۱)

اسی "جواب" کی جستجو میں وہ مختلف چیزوں کو سامنے لاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ جہاں تک میری بصیرت میری راہ نمائی کرتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر جناح کی عظمت کا سب سے پہلا سبب اُن کی وہ خداداد بصیرت ہے جو قیادت کے لئے نہایت ضروری ہے چنانچہ اس کے ثبوت میں انہوں نے لکھا ہے کہ جب کانگریسیوں نے وزارتوں سے استعفیٰ دیا ہے تو مسٹر جناح کا یہ برق آسا فیصلہ کہ اس پر مسلمان "یوم نجات" منائیں۔ اُن کی خداداد بصیرت اور حسنِ تدبر کا زندہ ثبوت ہے۔ ایسا ثبوت جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں

"ایسے نازک وقت میں ایسا محکم اور اتنا جلد فیصلہ مسٹر جناح کے جوہرِ قیادت کی ایسی دلیل ہے کہ جس کا مقابلہ اگر کہیں کیا جاسکتا ہے تو مسٹر چرچل کی اس تقریر سے جو انہوں نے ۲۲ جون کو جرمنی کے روس پر حملہ کرنے کے وقت کی تھی۔"

غور فرمایا آپ نے! آج ایک انگریز کے نزدیک دُنیا بھر کا سب سے بڑا سیاست داں مسٹر چرچل ہے۔ وہی انگریز مسٹر جناح کے جوہرِ قیادت کا مقابلہ کرتا ہے تو اس کی مثال میں چرچل کا وہ معرکۃ الآرا فیصلہ پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ساری دُنیا کے مدبرین کے نزدیک درخورِ تحسین و آفرین قرار دیئے گئے تھے۔ یوم نجات کا فیصلہ ہم نے، آپ نے اور جناب فضل الحق صاحب سب نے دیکھا لیکن اس کی اصلی اہمیت کے اندازہ کے لئے ایک بڑے سیاست داں کی ہی ضرورت تھی! یہ تو مسٹر جناح کے ایک فیصلے کے متعلق ہے کیا معلوم باقی باتیں جو ہماری نگاہوں میں یونہی عام حیثیت سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اہل الرائے حضرات کے نزدیک کتنی بڑی اہمیت کی آئینہ دار ہونگی۔ یہ تو رہا تدبر کے متعلق۔ اب کیرکٹر کے متعلق دیکھئے۔ مسٹر مور رقم طراز ہیں۔

"مسلمانوں میں مسٹر جناح کی بڑھتی ہوئی رفعت صرف اُن کی سیاست دانی اور شاطرانہ اندازِ حرب کی وجہ سے نہیں۔ مسلمانوں نے خود مجھ سے کہا ہے کہ اس کا اصل راز یہ ہے کہ مسٹر جناح نے اپنی تمام پبلک زندگی میں ثابت کر دیا ہے کہ وہ جاہ طلب نہیں ہیں۔ اگر مسٹر گاندھی اسلئے دیانتدار ہیں کہ انہیں مال و متاع سے کچھ دلچسپی نہیں رہی تو مسٹر جناح اسلئے Incorruptible ہیں کہ اُن کے پاس (خدا کا دیا) بہت کچھ ہے۔ اور وہ اپنے قانونی پیشہ سے معاش کی طرف سے ایک

ذی وقار فارغ البالی حاصل کر چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بہت بڑی بات ہے"۔

یہ ہے مسٹر جناح کی قیادت اور عظمت کا حقیقی راز۔ ان کا کیر کٹر اتنا بلند ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی خریدے نہیں جا سکتے اور دنیا کی بڑی سے بڑی جاذبیت بھی انہیں اصول پرستی سے ڈگمگا نہیں سکی۔ جنہیں اُن کے اس مقامِ بلند سے حسد ہو وہ آئیں اور اپنے اندر ان سے بڑھ کر جوہر پیدا کر کے ان سے اس مقام کو چھین لیں۔ چھین لینے کی تو ضرورت ہی پیدا نہ ہوگی جن مسلمانوں نے آج جناح کو یہ منصب دے رکھا ہے جب کوئی اور مسلمان ان سے بڑھ کر تدبر۔ اخلاص اور قربانی کا ثبوت دیگا یہی مقام اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اس میں تڑپنے اور تلملانے کی کونسی بات ہے۔

ضمناً یہ بھی دیکھئے کہ مسٹر جناح نے اتنے موانع اور اسباب و ذرائع کے فقدان کے باوجود قوم کی آواز کو کس حد تک مؤثر بنا دیا ہے۔ ذرا ۱۹۳۶ء کی حالت پر مڑ کر نظر ڈالئے اور اندازہ فرمائیے کہ ہماری کیفیت کیا تھی من حیث القوم ہمیں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ پوچھنا تو ایک طرف ہمارے الگ قومی تشخص کو کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ "کانگریس اور گورنمنٹ ملک میں دو ہی جماعتیں" تسلیم کی جاتی تھیں۔ اور اکثریت کی حکومت ایک مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی جس میں مسلمان اقلیت کو کچھ تحفظات دیئے جانے کے سوال پر غور و خوض ہوا کرتا تھا۔ بے کسی اور بے بسی، تشتت و انتشار کے ان مایوس کن حالات میں یہ اللہ کا بندہ اٹھا اور اس نے اپنی ان تھک کوششوں سے "اپنوں" کی طرف سے ہر وقت کی کھٹک کے باوجود بفضلِ ایزدی آج حالت یہاں تک پہنچا دی کہ اکثریت کی حکومت کا تصور آج مخالفین کے نزدیک بھی ایک ناقابلِ عمل حقیقت بن کے رہ گیا ہے۔ چنانچہ مسٹر آر تھر مور لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کو بھی چاہئے کہ جس طرح یورپ نے کیا ہے اکثریت کی حکومت کے فرسودہ خیال کو نہایت سادگی اور سکون سے خیرباد کہہ دے" (اسٹیٹسمین ۲۲ ۱۱/۴۴)

اور دیکھئے مسٹر آر تھر مور اگرچہ پاکستان کی اسکیم کے پورے طور پر حامی نہیں ہیں (وہ صوبوں کی تقسیم جدید اور تبادلۂ آبادی تک کے حامی ہیں، الگ مرکز کے حامی نہیں ہیں) لیکن بایں ہمہ انہیں اعتراف ہے کہ۔

"تحریک پاکستان ہماری آنکھوں کے سامنے ماہ بماہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ یہ اس صورت میں کم ہوگی جب اس بات کو تسلیم کر لیا جائیگا کہ اقلیتوں کو ثقافتی اعتبار سے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ اتنا ہی کافی نہیں کہ

مسٹر جناح سے یہ کہدیا جائے کہ کانگریس ایک قومی جماعت ہے۔ فرقہ وار ادارہ نہیں۔ اسلئے اس پر اعتماد کر لینا چاہیئے۔ (اسٹیٹسمین ۲۲ اپریل)

اس مقالہ میں مسٹر مور نے جناب ابوالکلام آزاد کے متعلق ایک دلچسپ بات کہی ہے وہ لکھتے ہیں کہ آج بھی جناب آزاد کا بہت سے مسلمانوں پر روحانی اثر ہے۔

"اگرچہ انہیں افسوس ہے کہ سیاسی وجوہات کی بنا پر انہیں اب اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ کلکتہ کے میدان میں عید کی نماز کی امامت کریں۔ (اسٹیٹسمین ۲۲ اپریل)

معلوم نہیں اسے جناب آزاد کی تعریف سمجھا جائے یا مذمت۔ مسلمانوں کی امامت کا مسئلہ مسلمانوں کی اکثریت حل کرتی ہے۔ اور جب یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت جناب آزاد صاحب کو اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کرتی تو ظاہر ہے کہ مسلمان اکثریت پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ بنگال میں خلفشار پیدا ہوا تو جناب آزاد جس طرح سندھ کی وزارت قائم کرنے کے لئے بھاگ کر گئے تھے، اسی طرح جیل سے نکل کر سیدھے کلکتہ پہنچے اور لیگ کے خلاف وزارت قائم کرنے میں مشاورت کی مجالس قائم کیں۔ انہیں مسلمانوں کی جمعیت کے پریشان ہونے سے کسقدر خوشی ہوتی ہے۔؟

ہمارے راہ گم کردہ بھائی فضل الحق صاحب بار بار فرماتے ہیں کہ وہ لیگ کے بہت دیرینہ وفاکیش ہیں اور انہوں نے لیگ کی بہت سی خدمات کی ہیں۔ یہ بجا اور درست لیکن ان خدمات کا صلہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ لیگ کے سینہ میں خنجر گھونپ دیں اور لیگ کی طرف سے انہیں دعائیں دی جائیں اور سینے سے لگایا جائے اگر کوئی ماں اپنے بچے کو قتل کر ڈالے اور اپنی مدافعت میں یہ دلیل پیش کرے کہ اس نے بچے کو پالا پوسا، اپنا خون پلایا، جوان کیا، اس کے بچے پر احسانات ہیں اسلئے اسے حق حاصل تھا کہ بچے کو قتل کر ڈالے۔ تو آپ خود ہی فرمایئے کہ کیا یہ عذر عدالت میں قابلِ پذیرائی ہوگا؟ اطاعت تو وہ شے ہے کہ اس میں ایک ثانیہ کیلئے سرکشی کا خیال سب کئے کرائے کو باطل کر کے رکھ دیتا ہے کیا آپ نے نہیں سنا۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے ۔۔۔ اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا؟

لیکن پھر سوال وہی پیدا ہوتا ہے کہ جناب فضل الحق اور نواب صاحب ڈھاکہ کو اگر لیگ سے نکال بھی دیا گیا تو ان کا بگڑا کیا؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب لیگ سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے پوچھئے۔ جو شخص مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے مسلمان اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اس سے کوئی تعلق باقی نہ رکھیں تاکہ اسے محسوس ہو جائے کہ مسلمان اُسے اپنے میں سے نہیں سمجھتے لیکن افسوس ہے کہ ہم میں ابھی تک اتنی غیرتِ ملی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ لیگ نے سر سلطان احمد وغیرہ کو جماعت سے الگ کیا اور لیگ کے حلقہ سے باہر اُن کا بدستور استقبال ہو رہا ہے۔ ابھی اگلے دنوں بمبئی میں سر رحمت اللہ چونئے کی طرف سے ان کے اعزاز میں استقبال کی تقریب منعقد ہوئی (ہندوستان ٹائمز ۲۰/۱۲/۴۴) اس میں شبہ نہیں کہ یہ لوگ اگر انتخاب کے لئے کھڑے ہوں تو عام مسلمانوں کی طرف سے کبھی منتخب نہ ہو سکیں لیکن مسلمانوں کو اس کا بھی احساس ہونا چاہئے کہ انتخاب کے علاوہ اور بھی مواقع ہیں جہاں ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ایسے لوگ ہمارے نمائندے نہیں ہیں۔

اس تمام خلفشار میں جہاں اتنی باتیں وجہ پریشانیٔ خاطر ہوئیں ایک چیز ایسی بھی سامنے آئی جس سے نگاہوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ مغرب کی جمہوریت اپنے ساتھ جو مختلف قسم کی لعنتیں لائی ہے ان میں ایک بڑی لعنت "انتخاب" کا طریقہ ہے امیدوار کھڑے ہوتے ہیں اُن کے موافق اور مخالف پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ پگڑیاں اچھلتی ہیں۔ سر پھٹول ہوتا ہے، اچھے بھلے اکٹھے رہنے والوں میں خواہ مخواہ پارٹی بازی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر آراء شماری ہوتی ہے، کامیاب امیدوار کے جلوس نکلتے ہیں، ناکاموں کو فضیحت ہوتی ہے۔ ایک طوفانِ بدتمیزی ہے جو شروع سے آخر تک ہنگامہ خیز رہتا ہے اس سے نہ کوئی "مسٹروں" کی جماعت محفوظ ہے نہ "مولویوں" کی۔ جمیعت العلما تک کو دیکھئے تو وہی مغربی انداز۔ لیکن بنگال کی مسلم لیگ پارٹی نے اپنے لیڈر کے انتخاب میں جو طریق کار اختیار کیا وہ اس ہنگامہ بازی سے بالکل الگ تھا کوئی امیدوار نہ تھا اور ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ وہ جسے بہتر خیال کرے اس کا نام لکھ کر دیدے جس کے حق میں سب سے زیادہ آرا موصول ہوئیں وہ لیڈر منتخب ہو گیا اور باقیوں کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا کہ کون کون سے نام تھے اور اُن کی کتنی کتنی آرا ر کسقدر پر سکون اور صحیح انداز سے یہ انتخاب عمل میں آیا۔ شاید یہ سعادت بھی "مسٹروں" کے حصے میں لکھی تھی کہ وہ بتائیں کہ مغربی طریقِ انتخاب کی لعنت سے کس طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ خدا کرے اسی طرح رفتہ رفتہ ہماری یہ ملی جماعت طرقِ کار کے صحیح خطوط پر متشکل نظر آئے۔

(۲)

جب سے پاکستان کا لفظ ہمارے ہاں عمومی حیثیت سے مروج ہوا ہے اُس کی مختلف توضیحات و تشریحات کی جارہی ہیں اور لیگ کے لاہور کے ریزولیوشن کو بھی مختلف معنی پہنائے جارہے ہیں لیکن پچھلے دنوں لکھنؤ پاکستان کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ پاکستان کیا ہے، انہوں نے فرمایا۔

"پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کو دو ایسے آزاد حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جہاں ہند و اور مسلمان اپنے اپنے ملک پر خود حکومت کریں۔" (ڈان ۱۲/۱ ء)

ہم اس پر اتنا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ "مسلمانوں کے حصہ ملک میں نظامِ حکومت قرآنی ہوگا۔" اس کے متعلق خود مسٹر جناح کئی مرتبہ تصریح فرما چکے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس کے بعد اس باب میں کسی غلط فہمی پھیلانے کی گنجائش باقی نہ رہیگی۔

---

(۳)

دہلی سے مسلم لیگ کی پالیسی کا حامی ہفتہ وار (انگریزی) اخبار "ڈان" شائع ہو رہا ہے۔ ہم نے اس جریدہ کا شگفتہ نگہی سے استقبال کیا اسلئے کہ ایک انگریزی اخبار کی ضرورت کا احساس ایک عرصے سے ہر قلب حساس کے لئے وجہ اضطراب ہو رہا تھا۔ ہمیں اس اخبار کی اشاعت سے فی الحقیقت بڑی خوشی ہوئی۔ اخبار چونکہ ہنوز عہدِ طفولیت میں ہے اس لئے اس کی سرسری خامیوں سے چشم پوشی ضروری ہے۔ لیکن اس کے ۷ دسمبر کے مقالۂ افتتاحیہ میں ایک ایسی چیز نگاہوں کے سامنے آئی ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اُسے دیکھنے کے بعد

اگر خاموش بنشینم گناہ است"

اس اخبار میں غالباً یہ پہلا مقالہ ہے جس میں قرآن کریم کا لفظ آیا ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ دُنیا اگر اس صراطِ مستقیم پر چل پڑے، جو قرآن کریم نے تجویز فرمایا ہے تو اُسے کسی نئے نظام کی ضرورت باقی نہیں رہتی قرآنِ کریم ایک جامع ضابطہ زندگی اور تمام نوعِ انسانی کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ (بقیہ برصفحہ ۶۳)

ہمارا جُرم

قرآن کریم انسانوں کی فکر و عمل کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے آیا تھا۔ ان لوگوں کی طرف سے جو اس انقلاب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی مخالفت ضروری تھی وہ ہر قسم کی مخالفت کرتے تھے لیکن قرآن کا یہ اعجاز تھا کہ جہاں کسی کے کان میں اس کی ایک آیت بھی پڑ گئی۔ طبع سلیم اسے قبول کرنے پر فوراً آمادہ ہو گئی۔ اس لئے مخالفین کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ قرآن کے الفاظ کسی کے کان میں پڑنے ہی نہ پائیں۔ چنانچہ خود قرآن کریم اس پر شاہد ہے کہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ ۴۱/۲۶

اور کفار کہتے ہیں کہ اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور مچاؤ تاکہ تم غالب آجاؤ۔

یعنی وہ اپنی کامیابی اس میں سمجھتے تھے کہ قرآن کریم میں شور مچا دیا جائے تاکہ نہ کوئی اسے سنے نہ کسی پر اس کا اثر ہو یعنی قرآن کریم کے اثر و اعجاز کے سامنے وہ عملاً اپنی شکست تسلیم کرتے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ دلائل و حجت سے ہم اس کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اس کی مخالفت کا ایک ہی طریقہ کارگر ہو سکتا ہے یعنی کوئی اسے سننے ہی نہ پائے۔ اسے کسی تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔

کفار قرآن کریم کی مخالفت کیوں کرتے تھے! اس لئے کہ قرآن کریم ان کی اس روش زندگی کو جھٹلاتا تھا جس پر وہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید سے چلے آرہے تھے اور اس روش کو علم و بصیرت کی روشنی میں پرکھتے نہیں تھے اور نیز اس لئے کہ قرآنی نظامِ زندگی میں ان کی اپنی سیادت و امارت ختم ہو جاتی تھی اگر وہ دنیاوی اقتدار کی مسندوں پر متمکن تھے تو انہیں ان کے چھن جانے کا خوف تھا اور اگر دینی گدیوں پر مستولی تھے تو ان کے کھو جانے کا بھی خطرہ تھا۔ موہوم خوف و خطر نہیں بلکہ یقینی خطرہ۔ قرآن کے سامنے ملوکیت اور برہمنیت دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کفار کی وہ روش جس کا ذکر اوپر کی آیت جلیلہ میں آیا ہے۔ کچھ عہد رسالتمآبؐ کے کفار کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ دنیا میں جب تک اور جہاں جہاں کفر و ایمان کی آویزش اور حق و باطل کی کشمکش موجود ہے مخالفین قرآن کریم کا یہ اندازِ مخالفت بھی موجود ہے اور موجود رہے گا۔ "شور مچانے" کے طریقے بدل سکتے ہیں۔ لوگوں کو قرآن کے پاس جانے سے روکنے کی تدابیر کی شکلیں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ لیکن مخالفت کی یہ روح ہمیشہ موجود رہے گی۔ اس لئے کہ ہر

مخالف پر یہ حقیقت عیاں ہے کہ وہ دلائل و براہین سے قرآن کے مقابلہ میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اسے قرآن کا یہ چیلنج یاد ہے ﴿ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴾ - اگر سچے ہو تو اپنے دلائل پیش کرو۔ اس لئے قرآن کریم کی مخالفت کا ایک ہی طریق ہے کہ لوگوں کو اس کے پاس آنے سے روکو۔ اس کی آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچنے دو۔

یہاں تک تو ہم نہایت فخر اور بیباکی سے لکھتے چلے آئے۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں اس کے تصور سے ہماری رُوح کانپتی ہے۔ ہاتھ میں قلم لرزتا ہے اور ندامت سے آنکھیں زمین میں گڑی جارہی ہیں۔ اس لئے کہ اس سے پیشتر تو قرآن کی اس مخالفت کا تذکرہ تھا جو کفار کی طرف سے کی جاتی تھی۔ لیکن اب قرآن کی اس مخالفت کا ذکر آرہا ہے جو کفار کی طرف سے نہیں بلکہ (پناہ بخدا) خود ان کی طرف سے ہوئی اور ہو رہی ہے جو قرآن پر ایمان کے مدعی ہیں۔ اور ندامت کے ساتھ حیرت کہ اس مخالفت میں طریقہ بھی وہی اختیار کیا جاتا ہے جو مذکورہ صدر آیۂ مقدسہ میں بیان کیا گیا ہے یعنی لوگوں کو قرآن تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔ شور مچا دیا جائے۔

یا للعجب! قرآن پر ایمان کے مدعیوں کی طرف سے قرآن کی ایسی مخالفت کس بناء پر؟ اسی بناء پر جس پر قرآن نہ ماننے والوں کی طرف سے مخالفت ہوئی یعنی قرآن کا یہ تقاضا ہے کہ آباء و اجداد کی طرف سے جو روش زندگی ورثہ میں ملی ہے اسے قرآن کی روشنی میں پرکھو اور نیز اس لئے کہ قرآن آجانے سے ان کی ملوکیت اور براہمنیت کے اقتدار چھن جاتے ہیں۔ یہی خوف قرآن کو نہ ماننے والوں کے دل میں جاگزیں ہوا اور انھوں نے مخالفت شروع کر دی۔ یہی خطرہ قرآن پر زبانی ایمان رکھنے والوں کو لاحق ہوا اور انھوں نے مخالفت شروع کر دی۔ نہ ماننے والوں کی مخالفت بھی آج تک جاری ہے۔ اور ایسا ماننے والوں کی بھی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے لوگوں کو قرآن سے باز رکھنے کے لئے جو تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ ان کی شکلیں بدلتی رہی ہیں لیکن رُوح ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں　　　اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

غیروں کی طرف سے جس جس رنگ میں مخالفت ہوئی ۔ اس کے ذکر کو چھوڑ کر ان پر گلہ کیا! اپنوں کی طرف سے جو مخالفتیں ہوئیں ذرا انھیں نگاہ میں رکھو اور پھر دیکھو کہ کیا غیروں کی مخالفت اتنا نقصان پہنچا سکتی تھی جتنا اپنوں کی مخالفت پہنچاتی ۔ اور پہنچا رہی ہے ۔ اس مخالفت کی تفصیلات اپنی صدیوں کی تاریخ کے اوراق پر پڑھیے اور خون کے آنسو روئیے ۔ اور اگر اتنی فرصت نہ ہو تو کم از کم "ارمغان حجاز" میں ابلیس کی مجلس شوریٰ کی روئداد ہی دیکھیے اور غور کیجئے کہ مسلمان کو قرآن سے دور رکھنے کے لئے کس کس مقدس تدبیر سے کام لیا گیا۔ یہ سب کس لئے؟ محض

اس لئے کہ دین و دنیا کی گدّیوں کے اجارہ داروں کی سیادت کا طلسم نہ ٹوٹنے پائے۔

یہ قصہ ماضی تھا لیکن آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے کیا آج مخالفت میں کچھ کمی کی جا رہی ہے؟ اور کیا مخالفت کی اس کہنہ روش میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہے! یعنی یہ کہ کسی کے کان میں قرآن کی آواز پڑنے نہ دو۔ جب کوئی قرآن کی طرف دعوت دے تو خوب شور مچاؤ۔ چاروں طرف سے غل مچا دو کہ کافر۔ بے دین۔ گمراہ۔ ملحد۔ خدا اور رسولؐ کا دشمن۔ اسلاف کی عزت پر حملہ کرنے والا کسی "نئے ذہن" کا مدعی۔ غل مچاؤ اور ایسے زور سے مچاؤ کہ اس کی آواز کسی کے کان تک نہ پہنچنے پائے۔ کہ اگر قرآن کی آواز کسی کے کان تک پہنچ گئی تو ہماری سیادت ختم ہو جائے گی۔ برہمنیت کی گدّیاں چھن جائینگی

جب آج سے کچھ عرصہ پہلے فرقۂ "اہلِ قرآن" کی اس طرح مخالفت ہوئی ہے تو ہم نے سمجھا تھا کہ مخالفت ان کی اس غلط روش کی بناء پر ہے جو فی الواقعہ غلط تھی۔ وہ اپنے غلو و تشدد میں رسول اللہ صلعم کی صحیح حیثیت کو ہی بھلا بیٹھے اور انھوں نے حضورؐ کا منصب صرف اس قدر سمجھا کہ آپ نے (معاذ اللہ) ایک چٹھی رسا کی طرح۔ اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچا دیا۔ یا آج کی اصطلاح میں یوں سمجھیے کہ ان کے نزدیک رسول کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک ریڈیو سٹ (آلۂ ابلاغ) کی سی ہے کہ محطۂ نشر الصوت (BROADCASTING STATION) میں جو کچھ نشر ہوا وہ آواز اس کے ذریعے سننے والوں تک آ پہنچی یہ غلطی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔

ان کی غلطی ضرور تھی۔ لیکن ہم نے اب محسوس کیا ہے کہ ہماری برہمنیت کی مسندوں کی طرف سے ان کی مخالفت ان کے اس غلط نہج سے کہیں زیادہ دعوت الی القرآن کی بناء پر تھی۔ یعنی وہ یہ غلطی نہ بھی کرتے تو بھی ان کی مخالفت ہوتی۔ یہ چیز ہم ذاتی تجربہ کی بناء پر لکھ رہے ہیں۔ قریب چار برس سے طلوع اسلام آپ کے سامنے ہے۔ اس کا مسلک۔ اس کی دعوت۔ اس کا نصب العین۔ اس کی روش سب کھلی کھلی اور واضح ہے۔ مسلمان کو پھر سے اس کے بھلائے ہوئے سبق کی یاد دلانا اس کے پیش نظر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ فراموش کردہ سبق سوائے اس کے اور کیا ہے کہ مسلمان پھر سے قرآن کو اپنی زندگی کا نصاب بنا لے۔ کہیئے! اس میں کونسی بات خلاف دین و آئین ہے لیکن چونکہ دعوت قرآن کی طرف لوٹنے کی ہے۔ اس لئے اس ذہنیت کی طرف سے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اس کی مخالفت کیوں نہ ہوتی؟ مخالفت! اور پھر مخالفت کا انداز بھی وہی جس کا ذکر قرآن کریم کی مذکورہ صدر آیت میں کیا گیا ہے۔ یعنی ایسا غل اور شور مچا دیا جائے کہ کسی کے کان تک قرآن کی آواز نہ پہنچنے پائے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ ذرا غور سے سنئے کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک۔

(۱) انسانوں کے لئے دین بنانا اللہ تعالےٰ کا کام ہے۔ کہ دین فطرت انسانی کے لئے ضابطۂ قوانین کا

نام ہے اور اللہ تعالےٰ خلاقِ فطرت ہے۔ دین کے اصول۔ زمان و مکان کی حدود سے بلند ہوتے ہیں۔ یعنی وہ تمام روئے زمین کے انسانوں کے لئے ہیں اور قیامت تک کے لئے واجب العمل ہیں ان میں نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوسکتا ہے نہ کمی بیشی۔ دین کی تکمیل اللہ تعالےٰ نے خود کر دی اور اسے محفوظ و مصئون شکل میں قرآن کریم میں منضبط کر دیا۔ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے سے دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں نصیب ہوتی ہیں اس ضابطۂ قوانینِ الٰہیہ کی اتباع کے بغیر نجات و سعادت کی کوئی شکل نہیں۔ یہ خدا کا آخری پیغام۔ اور نبی اکرمؐ آخری رسول ہیں۔

(۲) رسول اللہ صلعم کے ذمے دین کا پہونچانا (رسالت) اور دین پر عمل کر کے دکھانا (امامت) تھا حضورؐ نے ان ہر دو فرائض کی تکمیل بوجوہ احسن فرمائی۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی علم انسانی کے افق اعلیٰ اور کمالاتِ بشری کے بلند ترین مقام پر جلوہ بار تھی۔

(۳) حضورؐ نے دین پر عمل کر کے بتا دیا کہ اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام کس طرح ہوتا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہی دین کا منشا ہے جس میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے بجائے خدا کے قوانین جو (قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) نافذ ہوں گے۔

(۴) قرآن کریم کے قانون اصولی شکل میں ہیں۔ انھیں نافذ کرنے کے لئے تمہیدی یا فرعی قوانین کی بھی ضرورت ہوگی۔

(۵) حضورؐ نے جب حکومتِ الٰہیہ کو قائم فرمایا تو اس میں تمہیدی یا فرعی قوانین بھی مرتب فرمائے جو جزئیات کو محیط تھے۔ یہ قوانین۔ اصولِ قرآن کی روشنی میں حضورؐ کے اجتہاد اور مجلس مشاورت کے تفقد سے مدون ہوئے

(۶) جب حضورؐ نے قرآنی حکومت کو متمکن فرمایا حضورؐ کے سامنے عربوں کی ایک قوم تھی۔ اس قوم کے حالات اور اس زمانے کے اقتضاآت کو سامنے رکھتے ہوئے فرعی قوانین مرتب ہوئے۔ ان قوانین کی دو صورتیں تھیں ایک تو وہ جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ دوسرے وہ جو اقتضاآتِ زمانہ سے اثر پذیر نہیں ہو سکتے۔

(۷) حضورؐ کی متعین فرمودہ وہ عملی شکلیں جو اقتضاآت زمانہ سے اثر پذیر نہیں ہو سکتیں۔ امت کے لئے واجب الاتباع ہیں۔ ان میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ وہ اسی شکل میں قائم رہیں گی جن میں حضورؐ نے انھیں قائم فرمایا یہ شکلیں عمل متواتر کی صورت میں نسلاً بعد نسلٍ امت میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔

(۸) جو تمہیدی قوانین زمانہ کے اقتضاآت سے اثر پذیر ہونے والے ہونگے۔ ان میں حکومت الٰہیہ کے ارباب حل وعقد۔ اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کے ماتحت۔ فروعی تبدیلیاں کرتے رہیں گے۔ جیسا کہ جناب عبیداللہ صاحب سندھی نے تحریر فرمایا ہے کہ "اصل قانون اساسی متعین ہے۔ بائیں ہمہ اس وقت (یعنی حضورؐ کے عہد اور خلافتِ راشدہ میں) اور تھے اس وقت اور ہونگے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہونگی نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا۔ اور اسی کا نام فقہ ہے"۔

(۹) عہد رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں حکومت الٰہیہ کا قیام کس طرح ہوا اس کا علم اس عہد سعادت مہد کی تاریخ سے ہوگا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کتب روایات دین کی تاریخ ہیں تو اس سے یہی مطلب ہوتا ہے۔

(۱۰) اس تاریخ دین (کتب روایات) میں ظاہر ہے کہ مختلف قسم کی چیزیں ہوں گی۔ مثلاً

(۱) ان تمہیدی قوانین کی تحریری تفصیل جو زمانہ کے اقتضاآت سے اثر پذیر نہیں ہوتے اور جو عمل متواتر سے امت کے پاس منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔

(۲) وہ تمہیدی قوانین جو اقتضاآت زمانہ سے اثر پذیر ہونے کی وجہ سے قابل تغیر وتبدل ہیں۔

(۳) وہ باتیں جو حضورؐ نے اپنی ذاتی حیثیت سے فرمائیں یا اپنے زمانہ کی عام معاشرت کے لحاظ سے کیں۔

(۴) ایسی باتیں جو لوگوں نے وضع کرکے حضورؐ کی طرف منسوب کردیں۔

شق ۱ و ۲ کے متعلق پہلے لکھا جاچکا ہے۔ شق ۳ ایک واضح حقیقت ہے۔ حضورؐ عرب میں پیدا ہوئے۔ اُس زمانہ اور اُس ملک کی عام معاشرتی زندگی میں سے جن چیزوں کی ممانعت اللہ تعالےٰ نے نہیں فرمائی۔ حضورؐ نے لامحالہ وہی معاشرت اختیار فرمائی۔ رہنے سہنے۔ خورد ونوش۔ سواری۔ لباس مکان وغیرہ عام معاشرت کی چیزیں ہیں۔ کتب روایات میں بہت سی چیزیں اس نہج کی ہیں۔ بخاری شریف میں حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ وہ حضورؐ کے ساتھ پیلو کے درخت کے پھل چن رہے تھے اور حضورؐ فرماتے جاتے تھے کہ سیاہ پھل تلاش کرو کیونکہ وہ اچھا ہوتا ہے (بخاری شریف کتاب الانبیاء) شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور کھجوروں میں گابھا لگانے کا واقعہ درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ وہ امور ہیں جو حضورؐ سے علیٰ سبیل عادت یا بحسب اتفاق عمل میں آئے یا مصلحت وقت کے اعتبار سے سرزد ہوئے۔ (حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۰۲) اس باب میں سب سے بڑی مثال حضرت زیدؓ کا واقعہ ہے جو خود قرآن کریم میں مذکور ہے۔ حضورؐ نے حضرت زیدؓ سے واضح الفاظ میں فرمایا۔ کہ

امسك عليك زوجك ۳۳/۳۷ یعنی اپنی بیوی کو طلاق نہ دو بلکہ اپنے ساتھ رکھو لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دیدی۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد اپنی ذاتی حیثیت سے تھا۔ ورنہ اگر یہ دین کا حکم ہوتا تو حضرت زیدؓ کب جرأت فرما سکتے تھے کہ اس سے سرتابی کرتے! اور اگر (خدانکردہ) سرتابی کرتے تو یہ معصیتِ رسول تھی جس کی سزا ہمیں معلوم ہے۔ سو اس قسم کے امور حضورؐ کی ذاتی حیثیت سے متعلق ہیں اور کتب روایات میں مذکور ہیں۔

مشق چہارم کے متعلق طلوع اسلام کے صفحات پر خاصی بحث ہو چکی ہے۔ سوائے چند متشددین کے اور کسے انکار ہو سکتا ہے کہ ہماری کتب روایات میں صحیح اور ضعیف ہر قسم کی روایات موجود ہیں یہ کتابیں بہرحال انسانوں کی مرتب کردہ ہیں شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ میں ان کی صحیح پوزیشن یہ ہے کہ

صحیفۂ فردے از افراد بشر کہ بہ ارادۂ خود جمع علم پیغمبر کردہ است
مانند صحیح بخاری و صحیح مسلم در ملت ما" (الفرقان۔ صـ۲۶۵)

یعنی انسانوں میں سے ایک انسان کی کتاب جس نے علم پیغمبرؐ کو اپنے ارادے سے جمع کیا۔ مثلاً بخاری اور مسلم کی صحیحین۔

یا جناب عبیداللہ صاحب سندھی کے الفاظ میں۔

"ہماری کتب احادیث میں بالاتفاق غیر صحیح روایات بھی موجود ہیں۔ نیز ان کتب احادیث میں ایک واقعہ کو مختلف طریقوں سے بھی روایت کیا گیا ہے اور ہماری بہت سی کتب حدیث میں کاتبوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جن کو محققین علماء درست کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد اگر اناجیل اربعہ کو ہماری صحاح اربعہ (بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی) کے درجہ پر رکھدیا جائے تو ذرہ برابر اختلاف نظر نہیں آئے گا" (صـ۲۶۶)

یعنی ہماری کتب احادیث تاریخ کی کتابیں ہیں اور بقول جناب سندھی "اس طرح انبیاء کی سیرتوں کو جمع کرنا پہلے زمانہ میں بھی رائج رہا ہے" (صـ۲۶۵) جس طرح کتب اناجیل میں صحیح باتیں بھی ہیں اور موضوع بھی۔ اسی طرح ہماری کتب روایات کی حالت ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جس طرح باقی کتب میں" (صـ۲۲۸) علامہ حمیدالدین فراہیؒ کا ارشاد ہے۔ کہ

یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے ..... حدیث اجماع اور صحف اولیٰ یہ تینوں ظن و شبہ سے خالی نہیں ..... میں نے بعض روایات دیکھی ہیں جو

آیتوں کو جڑ سے اکھاڑ دیتی ہیں .... اکثر اہل حدیث کے دلوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ بخاری اور مسلم نے جو کچھ روایت کر دیا اس میں شک کی گنجائش نہیں پس ہم بعض قابل اعتراض مقامات لکھتے ہیں تاکہ تم سمجھ سکو کہ اللہ تعالے نے علماء کو رب ٹھہرانے کی شناعت فرمائی ہے۔ پس ہم ان کے غیر معقول فکر و فہم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں" (نظام القران)

کتب روایات کے متعلق یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ

(۱) یہ علم پیغمبر کو جمع کرنے کی انفرادی بشری کوششوں کا نتیجہ ہیں (شاہ ولی اللہؒ)

(۲) ان کی پوزیشن صحف اولے یعنی کتب اناجیل کی سی ہے جن میں انبیاء کی سیرتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ (جناب عبید اللہ سندھی)

(۳) ان میں صحیح اور ضعیف ہر قسم کی روایات مخلوط ہیں (جناب سندھی اور شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ)

(۴) ان کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے۔ بخاری اور مسلم بھی شک و شبہ سے بلند نہیں۔ (علامہ حمید الدین فراہیؒ)

عملی حیثیت کے بعد کتب روایات کی علمی حیثیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ روایات کے بغیر قرآن کریم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یعنی روایات، قرآن کریم کی تفسیر ہیں اور قرآن کریم کی جو تفسیر حضور نے فرمائی ہو اس سے بڑھ کر اور کونسی تفسیر ہو سکتی ہے۔ اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی جو تفسیر حضورؐ نے فرمائی ہو اس سے بڑھکر کوئی اور تفسیر نہیں ہو سکتی لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ کتب روایات صحیح اور غیر صحیح روایات کا مخلوط مجموعہ ہیں اور ان میں علامہ فراہی کے الفاظ میں

"بعض روایتیں ایسی ہیں جو آیتوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہیں اور ان کے نظام کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں" (نظام القران)

اور امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ ملاحم (پیشن گوئیاں) مغازی (لڑائیاں) اور تفسیر (تذکرۃ الموضوعات صـ ۸۲) معارف قرآنیہ کی تفسیر کے متعلق ایک چیز اصولاً سامنے رکھنی چاہیئے قرآن کریم انسانوں کے لئے قیامت تک کے لئے بطور نصاب مقرر کیا گیا ہے۔ اس لئے وہ قیامت تک انسانی علم و عقل کا ساتھ دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی جو آیت آج پوری طرح سمجھ میں نہ آسکے۔ آنے والے زمانہ کی علمی سطح بلند ہو جانے سے اس کی حقیقت بے نقاب ہو جائے۔ قرآن کریم میں تیرہ سو سال

سے لکھا ہوا چلا آرہا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے فرعونِ موسےٰؑ کی لاش کو پانی سے بچالیا تاکہ وہ آنے والوں کے لئے قدرتِ حق کی نشانی ہو (سورۂ یونس) اس کی تفسیر میں مفسرین حضرات کو طرح طرح کی قیاس آرائیوں سے کام لینا پڑا اور مشکلات پیش آئیں ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا لیکن ہمارے زمانہ میں جب علمائے اثریات نے مصر کے تہ خانوں سے فراعنۂ مصر کی ممی شدہ لاشوں کو دریافت کرکے انھیں دنیا کے سامنے رکھدیا۔ تو قرآن کریم کی اس آیۃ مقدسہ کی صحیح تفسیر سامنے آگئی مفسرین کے متعلق تو آسانی کہا جاسکتا ہے کہ یہ بات ان کے بس میں نہ تھی کہ قرآن کریم کی اس بیان کردہ حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیتے۔ لیکن نبی اکرمؐ علم انسانی کے معراجِ کمال پر تھے اللہ تعالےٰ نے حضورؐ پر ان تمام حقائق کو بے نقاب کرکے رکھ دیا تھا۔ اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ حضورؐ ایک آیت کی تفسیر بیان فرمائیں اور وہ (معاذ اللہ) حقیقت کے خلاف ثابت ہو۔ اس لئے اگر کتب روایات میں اس قسم کی تفسیری روائتیں ملیں جو علم اور عقل کے خلاف ہوں تو ہم بلا تامل کہدیں گے کہ یہ حضورؐ کی تفسیر نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی روایت کی صحت پر اصرار کرے گا تو زیادہ سے زیادہ (بصد تامل) اتنا کہا جاسکے گا کہ شاید حضورؐ نے اُس زمانہ کی عام علمی سطح کے پیش نظر۔ عوام کو سمجھانے کے لئے ایسا فرمادیا ہو۔ لیکن پھر بھی ہم پہلی صورت کو ترجیح دیں گے۔ یعنی یہ کہ روایت غیر صحیح ہے۔ مثلاً

(۱) فلکیات کے متعلق سترہویں صدی عیسوی سے پیشتر دنیا میں عام طور پر بطلیموس کا نظام صحیح مانا جاتا تھا۔ یعنی زمین کو ساکن تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ بھی عام عقیدہ تھا کہ "آسمان" شیشے کی بہت بڑی دل دار چھت سی ہے جس کی موٹائی کا اندازہ یہ ہے کہ وہ پانچ سو برس کا راستہ ہے اور یہ کہ ستارے اس شیشے کے اندر ٹکے ہوئے ہیرے اور جواہرات ہیں جو رات کو چمکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بعد کی علمی تحقیقات نے علیٰ وجہ البصیرت ثابت کردیا کہ بطلیموسی نظام غلط اور عوام کے عقائد توہمات ہیں۔ یہ مختلف کرّے فضا میں تیرتے پھرتے ہیں اور اپنے محوروں پر نیز ایک دوسرے کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ اور سورج معہ اپنے نظام کے ایک متعینہ منزل کی طرف جارہا ہے۔ تو اس وقت ہماری سمجھ میں آگیا کہ قرآن کریم کی ان آیات کا کیا مطلب ہے کہ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (تمام کرے اپنے اپنے فلک میں تیرتے پھرتے ہیں) والقمر قدّرنٰہُ منازِل (ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کررکھی ہیں) والشمس تجری لمستقرٍ لّھا۔ (الشمس اپنے مستقر کی طرف جارہا ہے) وغیر ذالک لیکن بخاری شریف میں آیت والشمس تجری لمستقرٍ لّھا کی تفسیر میں حسب ذیل روایت آتی ہے۔

"حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ ایک روز غروب آفتاب کے وقت میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضور نے فرمایا۔ ابوذر تم جانتے ہو کہ سورج کہاں ڈوبتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول ہی خوب واقف ہیں۔ فرمایا کہ یہ جاکر عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے۔ یہی مطلب ہے خدا کے اس قول کا وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ..... "(بخاری کتاب التفسیر)

فلکیات سے متعلق ایک دوسری روایت میں ہے:

"حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس نے ایک بار ارشاد فرمایا۔
کہ دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی اور عرض کیا کہ الٰہی۔ میرا بعض حصہ بعض کو کھائے جاتا ہے خدائے تعالیٰ نے اس کو دو سانسیں لینے کا حکم دیا۔ ایک سانس موسم سرما میں اور ایک سانس موسم گرما میں۔ چنانچہ بہت سخت گرمی اسی کی وجہ سے ہوتی ہے اور بہت سخت سردی بھی اس کی وجہ سے" (بخاری شریف۔ جلد دوم)

ہم اس چیز کو حیطۂ تصور میں بھی لانے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ (معاذ اللہ) حضور کو اس بات کا علم نہ تھا کہ غروب آفتاب زمین کی محوری حرکت کی وجہ سے ہے اور موسموں کا تغیر و تبدل اس کی دوری حرکت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہم ان روایات کو حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضورؐ نے مخاطب کی علمی سطح کی بناء پر ایسا سمجھا دیا تھا۔ تو بھی آنے والوں کے لئے۔ جب ان کے زمانہ کے علمی انکشاف حقیقت کو بے نقاب کر دیں اور وہ قرآن کے ان معارف کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ اس تشریح کی پابندی نہیں رہتی جو حضورؐ کی طرف منسوب کیجاتی ہے۔

یا مثلاً قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر یہ ذکر کیا ہے کہ جس خدا میں یہ قدرت ہے کہ وہ خاک کے ذروں کو انسان بنا سکتا ہے اس لئے یہ کیا مشکل ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد پھر زندگی عطا فرما دے! یعنی قرآن کریم مبدا سے معاد پر دلیل لاتا ہے اور یہ دلیل بڑی حکیمانہ ہے كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ (جس طرح ہم نے پہلی بار پیدا کر دیا تھا ویسے ہی دوبارہ پیدا کر دیں گے) لیکن اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت ملتی ہے۔

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں حضورؐ اقدس نے ارشاد فرمایا کہ حشر کے دن ننگے پاؤں ننگے سر

بغیر ختنہ کئے اٹھائے جاؤ گے ۔ اس کے ثبوت میں حضور نے یہ آیت تلاوت فرمائی ۔ کما بدأنا .... فاعلین ۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا سب سے پہلے حضرت ابراہیم کو لباس پہنایا جائے گا ۔ اس روز میرے بعض صحابیوں کو بائیں جانب والی قطار کی طرف کھینچا جائے گا (یعنی دوزخیوں کی قطار میں) ۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابی ہیں ۔ کھینچنے والا کہے گا کہ آپ کے جدا ہو جانے کے بعد یہ لوگ ایڑیوں کے بل (اسلام سے) لوٹ گئے تھے ۔ میں اس وقت وہی کہوں گا ۔ جو اس نیک بندے (عیسےٰ) نے کہا تھا وکنت علیھم شھیدا یعنی جب تک میں ان میں رہا ان کا نگران رہا (بعد کا میں ذمہ دار نہیں) ۔" (بخاری شریف جلد دوم)

اس تفسیر کو حضورؐ کی طرف کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے ؟ اور پھر روایت کا آخری حصہ تو صاف بتا رہا ہے کہ حضورؐ کے صحابہؓ کے دشمنوں کی طرف سے اس روایت کو وضع کیا گیا ہے ۔

یا مثلاً قرآن کریم میں ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۔ (۳۳ / ۶۹)

اے ایمان والو ۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے موسےٰ کو ایذا دی ۔ سو اللہ تعالےٰ نے ان سے ان باتوں سے جو وہ لوگ کہتے تھے ۔ اسے بری کر دیا اور وہ اللہ کے ہاں آبرو مند تھا ۔

قرآن کریم میں قصۂ بنی اسرائیل میں متعدد مقامات پر اس امر کا ذکر موجود ہے کہ وہ لوگ حضرت موسےٰ کو کس طرح قدم قدم پر دق کرتے تھے اور ان کے عظیم الشان مقصد کے راستہ میں روڑے اٹکاتے تھے ۔ حتیٰ کہ ان کا انداز تخاطب گستاخانہ اور روش شرارت آمیز اور فتنہ انگیز ہوتی تھی لیکن بایں ہمہ اللہ تعالےٰ نے انھیں سرفرازی اور آبرومندی عطا فرمائے ۔ اس آیت کی تفسیر میں ہمیں حسب ذیل روایت ملتی ہے ۔

" حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں ۔ حضورؐ والا نے ارشاد فرمایا کہ موسےٰ نہایت باحیا اور ستر کو چھپانے والے تھے ۔ چونکہ ان کے مزاج میں شرم تھی اس لئے کوئی ان کے حصہ بدن کو نہ دیکھ سکتا تھا ۔ لیکن بعض موذی بنی اسرائیل نے ان کو ایذا پہنچائی اور کہنے لگے کہ یہ اس قدر پردہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے ۔ برص ہے یا بادخایہ ہے یا کوئی اور مرض اس لئے خدائے تعالےٰ کا ارادہ ہوا کہ موسےٰ کو بنی اسرائیل کی افترا بندی سے بری کر دے ۔ چنانچہ

ایک روز حضرت موسٰےؑ تنہائی میں غسل کرنے کھڑے ہوئے ۔ کپڑے اتار کر پتھر پر رکھے اور خود غسل کرنے لگے ۔ غسل سے فارغ ہو کر جب کپڑے لینے کے لئے بڑھے تو پتھر کپڑے لے کر بھاگا موسیٰ لاٹھی لیکر پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے چلے ۔ او پتھر میرے کپڑے ۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے پاس تک پہنچ گئے ۔ لوگوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا ۔ کہ بہت عمدہ ساخت کے آدمی ہیں خدائے تعالےٰ نے اس طرح (بنی اسرائیل کی افترا بندی) سے ان کو بری کر دیا ۔ بالآخر پتھر رک گیا ۔ موسٰےؑ نے اپنے کپڑے لے لئے اور پھر لاٹھی سے پتھر کو مارنے لگے ۔ . . . .
حضور نے فرمایا اللہ تعالےٰ کے مذکورہ ذیل قول کا یہی مطلب ہے ۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ . . . . (بخاری شریف ۔ جلد دوم)

ہم اس تفسیر کو کبھی حضورؐ کی ذاتِ اقدس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے ۔

یا مثلاً یہ کہ ۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ جب خدائے تعالےٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ ہاتھ تھا ۔ . . . حضرت آدم کے بعد اب تک قد برابر چھوٹے ہوتے رہے“

(بخاری شریف ۔ جلد دوم)

اسے بھی ہم حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے کہ یہ چیز علمی تحقیقات اور اثری اکتشافات کے خلاف ہے یا مثلاً یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین جھوٹ بولے تھے (بخاری شریف جلد سوم) اس روایت کو بھلا کس طرح حضورؐ کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کی جا سکتی ہے ۔ اس روایت کے تذکرہ کے بعد جناب ابو الکلام صاحب آزاد لکھتے ہیں ۔ کہ

روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی یہیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا ۔ یقیناً راویوں سے غلطی ہوئی ہے ۔ اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی ۔

(ترجمان القرآن ۔ جلد دوم)

یا مثلاً یہ کہ ۔

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم پر ایسا جادو کیا گیا تھا کہ آپ خیال کرتے تھے کہ میں نے فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔ (بخاری شریف۔ جلد دوم)

فرمائیے! کہ حضورؐ کے متعلق یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ آپ پر (معاذ اللہ) جادو کا اثر ہو گیا تھا کہ یہ بھی (مثلاً) یاد نہیں رہتا تھا کہ میں نے نماز پڑھ لی ہے یا نہیں حضورؐ اس قدر عظیم المرتبت اور جلیل القدر روحانی قوتوں کے پیکر مقدس تھے کہ کسی دوسرے کی قوتِ ارادی کا اثر حضورؐ پر ہو ہی نہیں سکتا تھا حضرت موسےٰ کی خشک لاٹھی پر تو جادو کا اثر نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ تائید ایزدی شامل تھی اور نہ ہی حضرت موسےٰؑ پر ان ساحرین کا کوئی داؤں چل سکا۔ لیکن اس ذاتؐ اقدس و اعظم پر جس کی نظیر آسمان کی آنکھوں نے نہیں دیکھی (معاذ اللہ) ایسا جادو چل گیا۔

یہ اور اس قسم کی دوسری روایات ہیں جنھیں ہم کسی طرح بھی حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی روایات کی بنا پر جناب عبید اللہ صاحب سندھی نے لکھا ہے کہ

"جس قدر میری توجہ قرآن کی طرف بڑھتی گئی اور نوجوانوں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا۔ اسی قدر میرے سابقہ یقین میں زلزل پیدا ہونے لگا ..... بخاری میں میرے اشکالات کیا ہیں اور میں ایک یورپین نومسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ ان تفاصیل پر میں مجالسِ عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں۔ (الفرقان ص۸۴-۲۸۵)

ہم نے خود ایسی روایات کو نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے جن پر مجالسِ عامہ میں گفتگو نہیں کی جا سکتی جب حالت یہ ہو تو ان چیزوں کو دین کیسے قرار دیا جا سکے۔

پھر جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض چیزیں حضورؐ نے اپنے وقتی اور مقامی حالات کے ماتحت ارشاد فرمائی ہوں اور بعد میں آنے والوں پر بہ تغیر حالات۔ ان کی پابندی لازمی نہ ہو مثلاً ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو امامہ باہلی نے کاشتکاری کا کوئی اوزار دیکھا تو فرمایا۔ میں نے رسول اللہ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جس گھر میں یہ آلات آتے ہیں اس میں خدائے تعالےٰ ذلت داخل کرتا ہے" (بخاری شریف باب الحرث)

اگر کوئی شخص اس روایت کے صحیح ہونے پر اصرار کرے تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکیں گے کہ قریش کی اس

زمانہ کی عسکری زندگی اور اس کے مقتضیات کے پیش نظر حضورؐ نے شاید ان کے رجحان کو کھیتی باڑی کے کاموں سے ہٹانے کے لئے ایسا فرمایا ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کاشتکار جو نوع انسانی کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس کا پیشہ ذلت کا نشان کیسے قرار دیا جاسکتا ہے!

یا مثلاً یہ روایت کہ الائمۃ من قریش۔ امام یعنی خلفا قریش میں سے ہونگے۔ وقتی مصالح اور قریش کے اُس زمانہ کے جوہر خصوصی کے اعتبار سے ہی ارشاد نبوی صلعم قرار دیا جاسکتا ہے نہ کہ قیامت تک کے لئے مسلمانوں کے لئے بہ حیثیت دین واجب العمل خلافت کی تخصیص اگر دوامی طور پر قریش کے ساتھ کر دی جائے تو اسلام کی روح جمہوریت اور عالمگیریت فنا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس باب میں خود ایک دوسری روایت موجود ہے کہ تمہارے اوپر اگر کوئی ادنیٰ حبشی غلام بھی امیر مقرر کر دیا جائے تو تم اس کی فرمانبرداری کرو۔ اس دوسری روایت کو ہم اسناد پر کھے بغیر ہی صحیح تسلیم کرلیں گے اس لئے کہ یہ قرآنی تعلیم کی روح کے عین مطابق ہے۔

یہ ہے وہ مسلک جس کی طرف ہم دعوت دیتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی جو قرآن کے مطابق ہو وہ صحیح جو اس کے خلاف ہو وہ غلط۔ دین قرآن کریم کے اندر مکمل ہے اور وہی غلط اور صحیح کے پرکھنے کا خدائی معیار ہے کہا یہ جائے گا کہ اس طرح سے تو ہر شخص کو اجازت مل جائے گی کہ جس چیز کو اس کا جی چاہے۔ صحیح تسلیم کرے۔ جسے چاہے غلط قرار دیدے۔ اول تو یہ مفروضہ اس لئے غلط ہے کہ جب ہم نے قرآن کریم کو معیار حقیقی تسلیم کرلیا تو پھر کسی کے اختیار اور مرضی کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ دوسرے یہ کہ دین کی یہ انفرادی شکل جو آج ہم میں موجود ہے درحقیقت اسلامی شکل نہیں۔ اسلامی شکل میں ملت کا ایک مرکز ہوگا اور اس مرکز کا فیصلہ اختلافی امور میں قول ناطق ہوگا۔ اور اس مرکز حقہ کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہوگی۔ اب رہی ہماری موجودہ شکل سو اس تشتت و انتشار کے عالم میں ہمارے نزدیک راہِ صواب یہ ہے کہ نماز۔ روزہ وغیرہ میں جو جزئی سے اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ انھیں زیادہ اہمیت نہ دیجائے۔ وہ صدیوں سے چلے آرہے ہیں کچھ عرصہ اور چلنے دیجئے۔ لیکن انھیں سر پھٹول کا ذریعہ نہ بنائیے۔ اور ان اختلافات کا خیال کئے بغیر مسلمانوں کو مسلمانوں کی حیثیت سے باہمی ملاتے چلے جائیے۔ اس طرح ان میں یگانگت اور مودت پیدا ہونی شروع ہو جائے گی۔ اور وہ رفتہ رفتہ دین کی اصل کے قریب آتے جائیں گے۔ تاکہ ان میں پھر سے وحدت مرکز پیدا ہو جائے

اُس وقت سب تفرقے مٹ جائیں گے۔ آج ہماری سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ ہم نے فروعات میں تشدد اختیار کر رکھا ہے۔ جو شخص نماز میں سینے پر ہاتھ باندھتا ہے، اس کے نزدیک دین کا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو نیچے ہاتھ باندھتا ہے۔ دونوں ہر وقت ایک دوسرے کی تخریب و تذلیل کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور اسے بہت بڑی دینی خدمت بلکہ جہاد تصور کرتے ہیں حالانکہ دین کی اصل (یعنی مرکزِ ملت) سے دونوں بیگانہ ہیں۔ درخت کی جڑ کاٹ کر رکھدی ہے اور پتوں پر پانی چھڑک رہے ہیں کہ پھل حاصل کرلیں۔ اس تشدد کے ذمہ دار وہ حضرات ہیں جو دین کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں۔ اس تشدد میں ان کی سیادت کا راز مضمر ہے۔ اگر وہ ان چیزوں کی اہمیت کم کردیں تو یہ جو الگ الگ فرقوں کے الگ الگ مسند نشیں نظر آتے ہیں خود بخود کم ہو جائیں اور جب یہ فرقے مٹ کر ایک مرکز میں گم ہو جائیں تو الگ الگ فرعی مرکز بھی ختم ہو جائیں۔ یہ ہے وہ راز جس کے لئے یہ حضرات قرآن کی دعوت سے بدکتے ہیں اور شور مچاتے ہیں کہ کسی کے کان تک اس دعوت کی آواز نہ پہنچ جائے۔

جو کچھ گذشتہ سطور میں گذارش کیا گیا ہے۔ اس پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے اور پھر سوچئے کہ کیا اس میں کوئی بات ایسی بھی ہے جو دین کے خلاف ہو اگر آپ کے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات موجود ہو تو ہمیں مطلع کیجئے ہم اس پر پھر غور کریں گے۔ بار بار غور کریں گے۔ اور اگر آپ دیکھیں کہ اس میں کوئی چیز دین کے خلاف نہیں تو پھر اس کی پرواہ نہ کیجئے کہ ان چیزوں کی مخالفت کیوں ہو رہی ہے کہ مخالفت کا اصلی راز ہم بتا چکے ہیں۔ مخالفت صرف اس لئے ہے۔ کہ یہ دعوت قرآن کی طرف لوٹنے کی دعوت ہے۔ اور اس کیلئے اڑ لے لی جاتی ہے۔ حضورؐ کی عظمت کی یعنی عوام کو بھڑکانے کے لئے یہ مشہور کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ نبی اکرمؐ کی عظمت کے منکر ہیں (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) ذرا غور کیجئے۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ حضورؐ پر ایک کافر نے ایسا جادو کیا تھا کہ حضورؐ کو (نعوذ باللہ) یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ میں فلاں کام کر چکا ہوں یا نہیں۔ وہ تو حضورؐ کی عظمت کا ماننے والا سمجھا جائے اور جو یہ عقیدہ رکھے کہ حضورؐ کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ آپ پر کسی کے جادو کا اثر ہو سکے اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ حضورؐ کی عظمت کا قائل نہیں! آپ خود فیصلہ فرمالیجئے کہ ان میں سے کون حضورؐ کی عظمت کا قائل نہیں ہے۔ یاد رکھئے۔ ہم جن چیزوں سے انکار کرتے ہیں تو اس لئے انکار کرتے ہیں کہ ان کے صحیح تسلیم کر لینے سے حضورؐ کی عظمت و رفعت پر (معاذ اللہ) حرف آتا ہے اور اسے ہم کسی طرح بھی برداشت

نہیں کر سکتے۔ اگر کسی کا عقیدہ ان چیزوں کو برداشت کر سکتا ہے تو اسے یہ عقیدہ مبارک! لیکن ہمیں کیوں مجبور کیا جائے کہ ہم اس ذاتِ اقدس و اعظم کے متعلق جس کی محبت ہمارے لئے مایۂ زندگی اور سرمایۂ آخرت ہے۔ اس قسم کا عقیدہ رکھیں۔ کوئی اسے جنونِ عشق کہے یا سوائے محبت۔ ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

اور اگر یہ ایمان جرم ہے تو ہم اس جرم کی ہر سزا کے لئے بسر و چشم حاضر ہیں۔ وَاللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ شَہِیْد۔

اسلامی معاشرت

نقشِ ثانی

از جناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے مسلمانوں کی روزمرّہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے اس کی عادات و اخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اس کے تمدّن و معاشرت کے خط و خال اسکی تعلیم و تہذیب اس کے دنیاوی معاملات اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلقات غرض کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے اس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا گیا بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہیں بچوں کیلئے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب داخل کر لیا جائے تو طلباء کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔ قیمت ۴ محصول ۱

ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی

دنیا کی نجات

(پرویز)

جاڑے کی کپکپاتی رات ہے۔ کرزن روڈ پر وسیع پائیں باغ کے اندر ایک مرمرین قصرِ مزین کے بند روشندان کے شیشے سے بجلی کے لیمپ کی شعاعیں حسن بے پردا کی بنیائی نمائش کی غمازی کر رہی ہیں۔ کمرہ ایرانی قالینوں، فرنگی صوفوں اور حریر و اطلس کے زرنگار پردوں سے دامان باغبان و کفِ گلفروش کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی۔ اور مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے بلوری ساغروں کی کھنک اور آتش سیال کی دمک یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے آتشدانوں میں کوئلہ دہک رہا ہے، جس کے شعلے ابھر ابھر کر اس جہانِ رنگ و تعطر کو جھانکتے ہیں لیکن سرخی غازہ اور ارغوانیتِ صہبا کے سامنے اندر کر آتشِ حسد سے جل بجھتے ہیں۔ کیف و سرور کی اس دنیا میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں۔ اس لئے کہ یہ سب "انسان" ہیں۔ انہیں اس پر اختیار ہے کہ جب جی چاہے۔ فطرت کے عطیہ عظلے۔ امتیاز انسانیت یعنی عقل و ہوش کو کھو دیں۔ لیکن جماد و نبات کو یہ اختیار حاصل نہیں پتھر کا کوئلہ اپنے فریضۂ منصبی کی سرانجام دہی میں انتہائی جذب و انہماک سے سرگرم عمل ہے۔ وہ اس فضا کی ہوش ربا رنگینیوں سے متاثر نہیں۔ وہ اپنی گیس کو برابر ہوا میں ملائے جا رہا ہے۔ دروازے۔ کھڑکیاں۔ روشندان۔ سب بند ہیں۔ کمرے کی ہوا آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر مسموم ہوتی جا رہی ہے۔ حتّٰی کہ دم گھٹنے تک کی نوبت آ پہنچی۔ جو بالکل مدہوش و خود فراموش ہیں (فَاَنسَاھُمْ اَنفُسَھُمْ) انہیں تو فطرت کی یہ تنذیر بھی نہیں چونکا سکی لیکن جن میں ابھی کچھ شعور باقی ہے۔ انہیں فضا کی سمیت کا احساس ہوا اور بتایا نہ، کوئی دروازے کی طرف لپکا، کوئی کھڑکی کی جانب بھاگا۔ اس وقت نہ ساقی کا نازِ خرام ان کی راہ میں حائل ہوا۔ نہ نغمۂ مطرب کی دلکشی دامنگیر۔ نہ کسی کو صراحی کے ٹوٹ جانے کی پرواہ ہے نہ پیمانہ کے لڑھکنے کا احساس۔ اس وقت تمام توجہات دروازوں اور کھڑکیوں پر مرکوز ہیں۔ باہر کس قدر سردی ہے۔ اس کا بھی کسی کو خیال نہیں ہر ایک کی کوشش ہے کہ کسی طرح وہ سب سے پہلے باہر نکل جائے۔ اس افراتفری میں چٹخنیاں بھی نہیں کھلتیں۔ اس نفسا نفسی میں ایک دوسرے کو روندنے اور مسلنے تک سے بھی گریز نہیں۔ یہ کیا ہوا؟ وہ محفل جو ابھی ایک ثانیہ پہلے، عیش و طرب کی جنت دکھائی دے رہی تھی۔ کرب و الم کی جہنم کیوں بن گئی؟ کیف و سرور کے وہ جاں نواز نظارے

جن کے متعلق جی چاہتا تھا کہ کسی ساحر کے ہاتھ کی ایک طلسمی جنبش سے ہمیشہ کے لئے اپنے اپنے مقام پر منجمد ہو کر رہ جائیں تاکہ زمان و مکان کے حوادث ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ پیدا کر سکیں۔ انھیں خود اپنے ہاتھوں سے یوں پریشاں کیوں کر دیا؟ اس لئے کہ خلافِ فطرت فضا کی کثیف ہوا میں سانس لینے سے جان پر بن گئی۔ اور جان بچانے کی غرض سے پھر فطرت کی کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی۔ اپنے ہاتھوں سے بند کئے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں کو سرمار مار کر توڑنا پڑا۔ آئینِ فطرت کی خلاف ورزی کب تک کیجا سکتی تھی بند کمرے میں کوئلہ سلگانے کا فطری نتیجہ تھا کہ دم گھٹنے لگ جائے۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

لیکن سانس کا مسئلہ تو انسان کی طبیعی زندگی (Physical Life) سے متعلق ہے۔ اس میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں۔ جس کمرہ میں ان تمام انسانوں نے اس طرح بھاگ مچائی۔ وہاں ان کے ساتھ دو تین کتے بھی تھے انھوں نے بھی انہی کی طرح دروازوں سے ٹکریں ماریں۔ وہ بھی باہر نکلنے کے لئے انہی کی طرح۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ۔ بیقرار و بیتاب تھے۔ لیکن کیا انسان اور کتے میں کوئی فرق نہیں! کیا دونوں کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے؟ یہ تو غلط ہے۔ ابھی دم گھٹنے سے پہلے اس کمرہ میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کی کیف و مستی میں کتے کا کوئی حصہ نہ تھا حالانکہ وہ بھی برابر کا شریکِ بزم تھا۔ سو ظاہر ہے کہ اس حصے کا تعلق زندگی کے کسی ایسے "شعبے" سے ہے جو حیوان اور انسان میں مشترک نہیں۔ بلکہ انسان کے لئے مختص ہے۔ اور اگر یہ انسان کے لئے مختص ہے تو لامحالہ اس کا اثر بھی (اچھا ہو یا برا) "حیوانی زندگی" سے ماورا ہے اور جب یہ کیفیت دنیائے لذت و طرب میں ہے تو ذمہ داریوں کی دنیا میں یہ اختصاص اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ وہ اختصاص ہے جس کا تعلق "انسانیت" سے ہے جس طرح طبیعی زندگی کے لئے آئین و ضوابط متعین ہیں۔ اسی طرح دنیائے انسانیت کے لئے بھی دساتیر و قوانین مقرر ہیں۔ پھر جس طرح طبیعی زندگی سے متعلق آئین و ضوابط کی خلاف ورزی سے مضر اثرات کا نمودار ہونا لازمی ہے اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق قوانین سے سرکشی برتنے سے ضرر رساں نتائج کا مترتب ہونا تقاضائے فطرت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ طبیعی زندگی سے متعلق اثرات کا احساس جلدی اور بدیہی طور پر ہو جاتا ہے اور انسانی زندگی سے متعلق نتائج و عواقب کے لئے وقت بھی درکار ہوتا ہے اور دیدہ وری بھی۔ یہ اثرات سر کی آنکھوں کے بجائے دل کی آنکھوں سے جلدی اور متیقن طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب ذرا کرزن روڈ کے متذکرہ صدر کمرہ کی دیواروں کو پھیلانا شروع کیجئے حتکہ یہ پھیلتے پھیلتے یورپ کے چاروں گوشے بن جائیں۔ جو کچھ اس کمرہ کے اندر ہو رہا تھا اس کا مجموعی نام تمدنِ مغرب رکھ لیجئے۔ رنگ و چنگ کے سیلاب میں ڈوبے ہوئے مغرب کی نگاہیں حیوانی زندگی کے مقتضیات سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے اشیائے فطرت کو مسخر کیا لیکن کس لئے؟ صرف اس لئے کہ وہ ان کی حیوانی خواہشات کے بروئے کار لانے کا ذریعہ بن سکیں۔ وہ ساقی و مطرب کی جلوہ ریزیوں اور عشوہ طرازیوں میں کچھ ایسے مدہوش ہوئے کہ انسانیت کے تقاضوں کی یاد ہی باقی نہ رہی۔ وہ اس طوفانِ کیف و مستی میں غرق تھے۔ اور اس کا مطلقاً احساس نہ تھا کہ گرد و پیش کی فضا میں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن جنہیں اللہ نے دیدۂ بینا عطا فرمایا تھا۔ ان کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اس مسموم گیس پر جو ہوا میں اس قدر کثافت پیدا کئے جا رہی تھی جس طرح ایک طبیب حاذق سنکھیا کھانے والے کے انجام سے متعلق بہت پہلے آگاہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مردِ مومن جسے اللہ تعالیٰ قرآنی بصیرت عطا فرمائے۔ قوموں کی روشِ زندگی سے ان کے مآل کے متعلق اندازہ لگا لیتا ہے اور اس کے آئینہ ادراک میں وہ حوادث اپنی جھلک دکھا دیتے ہیں جو ابھی ضمیر فلک میں پہلو بدل رہے ہوں اس لئے کہ جس طرح حیوانی زندگی سے متعلق فطرت کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق بھی اس کے دساتیر و ضوابط ناقابلِ تغیر ہیں (وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا) لہذا جس طرح ایک طبیب حاذق خواص الاشیاء کے علم کی بنا پر اس کا اندازہ لگا لیتا ہے کہ فلاں چیز کا طبعی نتیجہ کیا ہونا چاہیئے۔ اسی طرح ایک مومنِ مفکر اقوام و ملل کے اعمال و عواطف کو میزانِ قرآنی میں رکھ کر یہ پہچان لیتا ہے کہ ان کی فلاں روش انھیں کس منزل کی طرف لئے جا رہی ہے۔ ایک ایسا ہی مردِ مومن تھا جس نے اپنی فراستِ ایمانی[1] سے آج سے بہت پہلے کہہ دیا کہ

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو

اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ (اقبالؒ)

لیکن مادہ پرستی کے نشہ میں سرشار مغرب کو ہوش کہاں تھا کہ وہ ان تنبیہات پر کان دھرتا۔ وہ اپنی روش

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ اللہ کا نور اس کی کتاب ہے۔

میں مست رہا اور فضا کثیف سے کثیف تر ہوتی چلی گئی تاآنکہ اس کی سمیت اس حد تک بڑھ گئی کہ اس میں دم گھٹنے لگا اور آج حالت یہ ہے کہ صرف یورپ ہی نہیں بلکہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں انسان اطمینان کا سانس لے سکے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ۲۵/۸

اور اس فتنے سے بچتے رہو جو اگر اٹھا تو اس کی زد صرف انہی پر نہیں پڑے گی جو تم میں ظلم کرنے والے ہیں (بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے) اور جان لو کہ اللہ (بداعمال کی) سزا دینے میں بڑا سخت ہے۔

اس لئے کہ ——— قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو ——— اس زہر آلود تمدن کا سرچشمہ اگر یورپ تھا تو باقی دنیا بھی تو اس کی پرورش میں برابر کی مدد معاون تھی اس لئے یورپ کی بھٹیوں سے ابھرنے والی آگ کے شعلوں کی لپیٹ سے باقی دنیا کیسے محفوظ رہ سکتی۔ عذاب آیا اور اس انداز سے کہ جو جو شکلیں ذہن انسانی میں متصور ہو سکتی تھیں وہ سب آنکھوں کے سامنے آگئیں۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۝ ۶/۶۵

کہدو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب بھیجدے یا تمہارے پیروں تلے (نیچے سے) کوئی عذاب پیدا کردے یا ایسا کرے کہ تم گروہ گروہ ہو کر آپس میں لڑ پڑو اور ایک (گروہ) دوسرے (گروہ) کی شدتِ (قوت) کا مزہ چکھے۔

غور فرمائیے! ان میں سے کونسی شکل ہے جو باقی رہ گئی ہے۔ آسمان سے عذاب۔ زمین سے عذاب۔ پانی میں عذاب ایک قوم دوسری قوم سے برسرپیکار۔ ایک ملک دوسرے ملک کے خون کا پیاسا۔ اور ایک دوسرے کی شدتِ قوت کا شکار اور پھر ایسے ایسے مقامات سے عذاب جو اس سے پیشتر وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ ابھی کل تک آسٹریلیا اور بحرالکاہل کے دیگر جزائر۔ محفوظ ترین مقامات خیال کئے جاتے تھے۔ لیکن آج یہ جگہیں سب سے زیادہ غیر محفوظ ہیں۔ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔ ۳۹/۲۵

ان پر ایسے ایسے مقامات سے عذاب آیا جو ان کی عقل و شعور (اور وہم و گمان میں بھی) نہ تھا۔

اس دم گھٹنے والی فضا میں جنھیں کچھ ہوش باقی ہے ان کے دل میں فطرت کی کھلی ہوا میں سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی ہے وہ ادھر ادھر دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں بیتابانہ دوڑ رہے ہیں انہی میں جریدہ اسٹیٹسمین کے مدیر مسٹر آرتھر مور بھی ہیں۔ یہ صاحبِ قلم۔ میدانِ صحافت و سیاست کے بالغ نظر شہسوار سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے سال گذشتہ متحارب ممالک کا دورہ کیا اور ان اسباب و علل کی تلاش میں سرگرداں رہے جو موجودہ خلفشار کا موجب ہیں۔ انھوں نے اپنی سمجھ کے مطابق ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنے اخبار میں

"ہماری موجودہ جنگ"

کے عنوان سے ایک مسلسل مقالہ لکھنا شروع کیا جو گذشتہ ماہ سے التزاماً شائع ہو رہا ہے۔ اس مقالہ میں انھوں نے زندگی کے موجودہ مسائل کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر چند یہ کوشش ایسی کامیاب نہیں جیسی ہونی چاہیئے تھی۔ اس لئے کہ وہ حقائق کا مطالعہ تنہا عقل کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں علم خداوندی کی روشنی ان کے پاس نہیں۔ اور جب انسان کے پاس علم خداوندی کی روشنی نہ ہو تو اس کی حالت آسمان میں چمکنے والی بجلی کی روشنی میں چلنے والے کی سی ہوتی ہے کہ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا (بقرہ) اس کی چمک سے جب فضا روشن ہو جاتی ہے تو دو چار قدم چل لیتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتے ہیں بایں ہمہ مسٹر مور کی طلب و جستجو اور تپش و خلش سے اتنا ضرور واضح ہو رہا ہے کہ مغرب اپنے غیر فطری نظامِ زندگی کے ہاتھوں کس درجہ تنگ آ چکا ہے اور آئین فطرت کے مطابق نظامِ حیات کے لئے کس درجہ بیتاب ہے۔ مسٹر مور مختلف سیاسی نظریات و رجحانات کے تذکرہ کے بعد (جن سے مجھے سروکار نہیں) لکھتے ہیں (جس کا مفہوم آزاد ترجمہ کی صورت میں یہ ہے) کہ۔

> میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک حرب کلی کی مصیبت میں مبتلا ہیں اور یہ وہ چاکِ داماں ہے جس کی تدبیر رفو سے نہیں ہو سکتی۔ یہ آگ ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیل کر رہے گی۔ اور جب ہٹلر اور مسولینی ختم ہو جائیں گے تو ان کے بعد بھی صفحۂ ارض کے ایک بڑے حصے پر اس آگ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ باہم خانہ جنگی یا مختلف طبقات کی لڑائی کی شکل

ہیں۔ اس مصیبت کا حل ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ آج ہٹلر کے انفرادی مقصد کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ ان میں خود ایک مشترک اجتماعی مقصد اور عقیدہ پیدا ہو جائے (اسٹیٹسمین ۱۹۴۲ء)

اس اجتماعی عقیدہ یا مقصد کی تصریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ساکنانِ ارض کو ہم اندازاً دو طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک وہ جو کوئی نہ کوئی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جن کا کوئی عقیدہ نہیں۔ وہ نظامِ جدید جسے ایک طرف ہٹلر اور دوسری طرف اشتراکیین پیش کر رہے ہیں مستقبل کے متعلق ایک عقیدہ کی شکل لئے ہوئے ہے۔ ......
ان کے نظامِ جدید یا عقیدہ میں ارتقاء کا تصور ناگزیر ہے لیکن کس قسم کا ارتقاء؟ ایک اندھی قوت کا ارتقاء۔ ان کے ہاں عقل کو بڑا بلند درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن عقل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مادی تغلب اور اس کے لئے اجتماعی نظم و نسق پیدا کر دیتی ہے۔ .... یہ تو ان کی کیفیت ہے جن کے ہاں مقصد زندگی ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے ان کے برعکس دوسرے ممالک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ خدا کا عقیدہ رکھتے ہیں نہ ارتقاء کا۔ وطن پرستی۔ فرض منصبی کا احساس غصہ نفرت۔ یا محض مجبوری۔ ان کی قوت عمل کے محرکات ہیں۔ .... ارتقاء کی جد و جہد میں ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بندر سے انسان تک کی ارتقاء کی کڑیاں تو تسلیم کر لیں گے لیکن یہ چیز ان کے تصور میں نہ آسکے گی کہ ارتقاء کا سلسلہ لامتناہی ہے اور اسے انسان سے آگے بھی بڑھنا ہے۔ (اسٹیٹسمین ۲۵ نومبر ۱۹۴۱ء)

یہ ہے مسٹر مور کے خیال کے مطابق دنیا کی موجودہ حالت۔ اب یہ دیکھئے کہ وہ اس مصیبت کا حل کیا تجویز کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اس عالمگیر جنگ میں کامیابی حاصل کرنے اور ایک نظامِ جدید کو متمکن کر لے کے لئے مختلف مذاہب کے باہمی امتزاج سے ایک جدید مذہب کی تشکیل ایسی ہی ضروری ہے جیسی آلات و سامانِ حرب کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنے کی" (ایضاً)

مذاہب کے امتزاج سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذاہب کی صداقتوں کو حشو و زوائد سے پاک کر کے ایک ایسے مذہب کی تشکیل کی جائے جو حیوانی ارتقاء کے بجائے لاہوتی ارتقاء (Divine Evolution) کا مؤید ہو۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہم اندہی ارتقار کے عقیدہ کا جواب لاہوتی ارتقار کے عقیدہ سے دیں گے بشرطیکہ یہ عقیدہ انسانیت کے مذہب کی حیثیت اختیار کرلے۔ظاہر ہے کہ مذہب میں کچھ نہ کچھ صداقت تو ضرور ہوتی ہے یعنی ان مختلف مذاہب مثلاً عیسائیت۔اسلام۔ہندومت۔بدھمت۔یہودیت وغیرہ میں" (ایضاً)

(آپ سردست اس پریشانی فکر ونظر کا چنداں خیال نہ کیجئے۔صرف یہ دیکھئے کہ حیوانیت کی زندگی کو منتہائے نگاہ سمجھنے والے۔خالص دہریت پسند۔مذہب گزیدہ یورپ سے یہ کس قسم کی آواز اٹھ رہی ہے) اس کے بعد مسٹر آرتھر مور لکھتے ہیں۔

"بنیادی مشکل اس مسئلہ کے حل میں یہ ہے کہ انسان ایک مختار بالارادہ ہستی ہے یا مجبور محض" (ایضاً)

اس کے بعد تحریر ہے۔

"دنیا کو آج اس چیز کی ضرورت ہے کہ اس سوال پر ارتقار کے مسلمہ نظریہ کی روشنی میں ازسرنو غور وخوض کیا جائے"

یہ غور وخوض کن خطوط پر ہونا چاہیئے۔اس کے متعلق رقمطراز ہیں۔

اس وقت جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے۔ان میں سے اغلباً ہر ایک اس صداقت کو تبرکاً بطور یادگار محفوظ رکھے ہوئے ہے جسے اس کے بانی نے سمجھا۔لیکن یہ صداقتیں زمانہ قدیم کے مذہبی معتقدات اور فروعات میں کچھ اس طرح گھر چکی ہیں کہ حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور وہ دورِ حاضرہ کے انسان کے لئے ناقابل اطمینان صورت اختیار کر چکے ہیں۔ہر ایک ملک میں روشن خیال طبقہ مذہب کو چیلنج دے رہا ہے۔اور اسی طرح مذہب کی گرفت ہر جگہ ڈھیلی ہو چکی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ نفس مذہب (نہ یہ مذہب اور وہ مذہب) اس انداز میں پیش کیا جائے کہ انسان کی بصیرت اسے تسلیم کرے۔مذہب پر ارتقار کے مسلّمہ نظریہ کی روشنی میں ازسرنو غور وفکر کی ضرورت ہے" (ایضاً ۲۶)

اس کے بعد مسٹر مور لکھتے ہیں کہ جامد مذہب نے (یعنی ایسے مذہب نے جو انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہ دے سکے) لوگوں میں بے حسی اور تعطل پیدا کر رکھا ہے اس لئے اگر مذہب کو ارتقائی نظریہ کی روشنی میں پیش کیا جائے تو اس صورت میں۔

"نسل انسانی کی تدریجی تکمیل اور زمین پر خدائی بادشاہت کا تصور ایک جوش انگیز امکانی شکل اختیار کرلے گا" (ایضاً)

اس کے بعد تحریر ہے۔

"عروج وارتقا (Evolution) میں خدا کا تصور۔ جامد نظریۂ تقدیر اور ہر قسم کے تعطل اور بے حسی کا نقیض ہوگا ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اگر کسی طرح یہ معلوم کرسکیں کہ "**خدا کی مرضی**" کیا ہے تو اس کا علم ہمارے اندر سحر پھونک دیگا اور اس طرح ہماری مرضی خدا کی مرضی کا گویا عکس بن جائے گی اور ہم ایک جدید مفہوم میں ارتقا کے اس لامتناہی ملکوتی ڈرامہ میں ایک با اختیار فعال ایکٹر کی حیثیت سے حصہ لے سکیں گے" (اسٹیٹسمین ۲۶ نومبر ۱۹۴۶ء)

آج دنیا جس عدم اطمینان و فقدان سکون کے جہنم سے گذر رہی ہے اس کی علت بیان کرتے ہوئے مسٹر مور لکھتے ہیں۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں مصنوعات، نوع انسانی کی خدمت کی غرض سے نہیں بلکہ اس مقصد سے تیار کی جائیں کہ ان کی فروخت سے دوسروں کا روپیہ بٹورا جائے۔ دولت سب سے اہم مسئلہ بنجاتی ہے۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح روپیہ جمع کیا جائے۔ قوت اور حفاظت روپیہ کے اندر سمٹ کر آجاتی ہے۔ دولت کی ملکیت کامیابی کا نشان اور فخر و عزت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ آج کوئی پند و نصیحت اس جذبہ کو بدل نہیں سکتی .... اس کے لئے جونہی ہمیں اس امر کا یقین ہو جائے کہ ہمارا موجودہ نظام معشیت ٹوٹ چکا ہے اور دوسرا کوئی ایسا نظام موجود ہے جو اس کی جگہ لے سکتا ہے تو ہمیں اپنا موجودہ نظام بدلنا پڑے گا" (اسٹیٹسمین ۲۸ ۱۱/۴۶)

ان اقتباسات میں جہاں ایک طرف صاحبِ مضمون کی پریشانیٔ فکر و نظر ان کی بیتابیٔ قلب کی غماز بن رہی ہے۔ دوسری طرف طلب و جستجو کی تڑپ بھی ایک ایک لفظ سے جھلک رہی ہے۔ صاف نظر آرہا ہے کہ مسموم فضا کی کثیف ہوا سے دم گھٹ رہا ہے، اور کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں دیوانہ وار جد و جہد ہو رہی ہے۔ مسٹر مور نے جو کچھ اپنے مقالہ کی ان تین چار اقساط میں لکھا ہے (جن کے اقتباسات اوپر دئے جا چکے ہیں) اس کا ماحصل چند الفاظ میں یہ ہے کہ۔

(۱) دنیا کی موجودہ مشکلات و مصائب مغربی نظامِ تمدن کے ثمرات ہیں۔

(۲) وہ نظامِ تمدن جس میں منتہائے نگاہ حیوانی مقتضیاتِ زندگی سے آگے نہیں بڑھتا۔ جہاں انسان

کو سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی سمجھ کر مستقبل کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا جاتا ہے۔ اور جہاں کامیابی۔ قوت اور عزت کا معیار دولت کا حصول و التزام ہے۔

(۳) ہٹلر اور مسولینی فقط اس غیر فطری نظام کے مظاہر ہیں۔ اس لئے اگر انھیں مغلوب بھی کر لیا جائے تو بھی دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔

(۴) دنیا میں امن و سکون کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ایک جدید نظام تمدن و عمرانیت کی بنا ڈالی جائے۔

(۵) وہ نظامِ جدید جس میں

(۶) انسان کو سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی نہ سمجھا جائے بلکہ اس سلسلہ کو لامتناہی خیال کیا جائے جس میں انسان کو اپنی تکمیل کے لئے عروج اور بلندی کے کئی اور مراحل طے کرنے ہیں۔ یعنی ارتقائے حیوانی کی جگہ ارتقائے انسانی کا نظریہ پیدا کیا جائے۔ اور

(ب) جس میں کامیابی۔ قوت اور عزت کا معیار دولت نہ ہو بلکہ جذبۂ خدمت ہو۔

(۶) اس نظام جدید کو بطور عالمگیر مذہب انسانیت پیش کیا جائے۔

(۷) اس مذہب کی تشکیل کے لئے مختلف مذاہب کی صداقتوں کا امتزاج کیا جائے کیونکہ مذہب کے اصلی حقائق ازمنۂ قدیم کی توہم پرستی اور فرعی مسائل کے پردوں میں چھپ چکے ہیں۔

(۸) مذہب کا مقصد جمود و تعطل نہ ہو بلکہ وہ انسان میں قوت عمل پیدا کرنے کا ذریعہ ہو جس سے انسان عروج و ارتقا کے منازل طے کر سکے۔ نیز وہ بصیرتِ انسانی کو اپیل کر سکے۔

(۹) انسانی جد و جہد کا ماحصل یہ ہو کہ وہ کسی طرح مشیت خداوندی (خدا کی مرضی) معلوم کر سکے اور پھر اپنی مرضی کو اس طرح خدا کی مرضی کے تابع کر دے کہ اس کی مرضی خدا کی مرضی بن جائے۔

(۱۰) اس طرح اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام ہو سکتا ہے۔

غور فرمائیے! عہد حاضر کے نظامِ زندگی کے ستائے ہوئے انسان کو جس چشمۂ سکون و راحت کی تلاش ہے ہر چند وہ اس کا پتہ پریشان الفاظ اور بکھرے ہوئے نشانات سے دے رہا ہے لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھیک وہیں پہنچنا چاہتا ہے جہاں اسلام پہنچاتا ہے۔ اسلام کے بنیادی خطوط خال

ہمارے سامنے ہیں۔ ان پر غور فرمائیے۔

(۱) اسلام میں نظامِ زندگی کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے جو ایک عبدِ مسلم کے فکر و نظر اور اعمال و احوال کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے یعنی انسان کو (خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ) دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وحدتِ خالق کے عقیدہ کا دوسرا فطری نتیجہ وحدتِ خلق ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ دنیا میں تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ نسل یا ملک کی تقسیم سے انسانیت کی تقسیم نہیں ہو سکتی اسی ایک عقیدہ سے وہ تمام اقتصادی۔ سیاسی۔ معاشی۔ معاشرتی۔ عمرانی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو آج انسان کے گرد مار پیچاں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں اور اسکی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں آج ایک نسل دوسری نسل کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک کے خلاف فوج کشی کر رہا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ یہ سب اس لئے کہ وحدتِ خلق کے بجائے نوعِ انسانی کو غیر فطری امتیازات سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کو کاٹ رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ یہ اپنا ہی دست و بازو ہے کسی غیر کا نہیں۔ معدہ اس فکر میں ہے کہ جو خوراک اس میں جا پہنچی ہے اسے اپنی ہی چار دیواری میں محبوس کرلے۔ ادھر دل و جگر کی یہ کوشش ہے کہ خوراک کو معدہ تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔ بلکہ حلق سے نیچے اترتے ہی جھپٹ لی جائے جس جسم کے نظام میں اس قسم کی نفسا نفسی پیدا ہو جائے۔ اس کا انجام معلوم!

(۲) پھر جیسا کہ طلوعِ اسلام کے صفحات پر ارتقاء سے متعلق مضامین میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اسلام کے نزدیک موجودہ انسان۔ سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔ اس وقت تک صرف حیوانیت کا ارتقا تھا۔ اب انسانیت کا ارتقاء شروع ہوگا۔ انسانیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس پیکرِ حیوانی میں صفاتِ الٰہیہ کا عکس و کرشمہ نمودار ہوتا ہے۔ جس قدر انسان ان صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا چلا جائے گا اسی قدر اس کی انسانیت مستحکم ہوتی چلی جائے گی۔ اس سلسلۂ عروج و صعود میں نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی معراجِ انسانیت کی مظہرِ اتم ہے۔ یہ اسلام کے بنیادی عقیدہ کا جزو ثانی ہے۔ یعنی ایمان بالرسالت۔ مغرب کی مادہ پرستی مافوق البشر کا تصور صرف حیوانی زندگی کی تکمیل میں ہی دیکھ سکی۔ نیٹشے کا فوق البشر زیادہ سے زیادہ شیر کی قوتوں کا مظہر ہے۔ حالانکہ شیر اپنی تمام قوتوں کے باوجود۔ انسانیت سے نچلی منزل میں ہے۔

(۳) اسلام بتاتا ہے کہ انسانیت کا نشوو ارتقاء زندگی کو ان قوانین کے ماتحت بسر کرنے سے ہوتا ہے جو انسانی فطرت کے مطابق ہیں۔ ان قوانین کے مجموعہ کا نام قرآن کریم ہے۔ یہی حکومت الٰہیہ کا ضابطۂ آئین ہے۔ فطرت کے دیگر قوانین کی طرح اس ضابطہ کے قوانین بھی غیر متبدل اور ناقابلِ ترمیم و تنسیخ ہیں اور بلالحاظ زمان و مکاں تمام نوع انسانی کے لئے ہیں۔ ان اصولی ضوابط کی روشنی میں ہر زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فرعی قوانین مرتب کئے جائیں گے اور اس طرح یہ نظامِ زندگی ایک جامد اور ساکن مذہب کے بجائے۔ انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے ساتھ ساتھ ہر مقام پر راہ نمائی کرتا جائے گا۔ قرآن انسانی عقل و بصیرت کو اپیل کرتا ہے۔ اور اس کے علم و شعور کی پرورش چاہتا ہے اس لئے اس میں توہم پرستی یا اندھی تقلید کو کوئی دخل نہیں۔

(۴) اسلام چند افراد کا نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کا عروج و ارتقاء چاہتا ہے اس لئے اس کا نظامِ زندگی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ اس کی ہیئت اجتماعیہ کا مرکز خدا کی حاکمیت کا اقرار ہے۔ جس جماعت میں یہ اقرار محسوس طور پر متشکل ہوتا ہے اس کا نام ملت اسلامیہ ہے جس کی شیرازہ بندی ختم نبوت کے عقیدہ سے وابستہ ہے یعنی یہ ملت۔ ملتِ واحدہ ہوگی۔ مختلف پارٹیوں میں منقسم نہیں ہوگی۔ ختم نبوت کا عقیدہ انسانی عقل و شعور اور فکر و تدبر کے نشوو ارتقاء کا بھی حامل ہے۔ وحی کے ذریعے نظامِ زندگی کے اصول متعین ہو گئے۔ ان اصولوں کے ماتحت جزئیات کی تشکیل انسانی تفقہ و تدبر کی رو سے ہوگی۔

(۵) اسلامی ہیئت اجتماعیہ میں کامیابی۔ قوت اور عزت کا مدار دولت نہیں بلکہ شرف انسانیت ہے۔ جس میں یہ شرف (استحکام خودی) زیادہ ہوگی وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہوگا۔ دولت اور قوت انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کیجائے گی۔ افراد یا کسی خاص گروہ کے استیلاء و تغلب کا ذریعہ نہیں بن جائے گی۔ اس لئے اسلامی نظامِ زندگی میں اکتناز کی بھی اجازت نہیں۔ نہ ہی اس امر کی کہ دولت صرف بالائی طبقہ میں ہی گردش کرتی رہے نیچے کے طبقہ میں آئے ہی نہیں۔ قرآن کریم کی نصوص صریحہ ان امور پر دلالت کرتی ہے۔

(۶) یہ ہیئت اجتماعیہ۔ جس کی وسعتیں زمان و مکاں کی حدود سے محصور نہیں ہوں گی۔ نظامِ انسانیت کو قوانین فطرت (یعنی ضابطۂ خداوندی) کے ماتحت چلانے کی ذمہ دار ہوگی اور اس طرح خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو جائے گی۔ انسان کو "خدا کی مرضی" اس کے قوانین کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ سو جب انسان اپنی مرضی کو خدا کے قوانین کے تابع کرلے تو اس کی مرضی عین خدا کی مرضی ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسان ایک طرف مختار بالارادہ اور دوسری طرف مجبور ہوگا۔ مجبور اس لئے کہ اپنے آپ کو ایک آفاقی نظام کے اصولوں کے تابع رکھے گا۔

اور مختار اس لئے کہ اس جبر سے جو اختیار پیدا ہوگا وہ اسے اس قابل بنا دے گا کہ تمام کائنات کو مسخر کرلے۔ استحکام خودی اور جوش کردار سے یہ اس مقام بلند پر جا پہنچے گا کہ خدا کے سوا کوئی اور قوت اس پر غالب نہ ہوگی۔

(۷) اس ہیئت اجتماعیہ میں ہر فرد اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھے گا اس لئے معاملات کی دنیا میں جادۂ عدل و انصاف سے ادھر ادھر نہیں ہٹ سکے گا یہ جواب دہی اس خدا کے سامنے ہوگی جو دل کی لغزشوں اور نگاہ کی خیانتوں سے واقف ہے اس لئے خدا کے اس بندے کے اعمال و افعال حاضر و غائب یکساں ہونگے اس نظام میں ہر شخص کو اس کا حق ملتا چلا جائے گا اور کوئی کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہوگا۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس　　نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

(اقبالؒ)

یہ ہے مختصراً وہ مذہب جس کی آج مسٹر آرتھر مور اور ساری دنیا کو تلاش ہے۔ لیکن مسٹر مور سچا ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ اس قسم کا مذہب مختلف مذاہب کے امتزاج سے پیدا کرنا چاہیئے اس لئے کہ اسے اس قسم کا مذہب کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ کہیں گے کہ جب اس قسم کا مذہب (اسلام) موجود ہے تو پھر مسٹر مور کو نظر کیوں نہیں آتا؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اسے اسلام نظر کہاں سے آئے؟ موجودہ مسلمانوں کی زندگی میں تو اسلام نظر نہیں آسکتا۔ باقی رہے اس کے مآخذ۔ سو وہ اندھی تقلید اور روایات کی چادروں میں اس طرح لپٹے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کے لئے بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اب اسلام نام ہے چند رسومات کا جن سے روح مدت ہوئی نکل چکی ہے۔ یا نام ہے باہمی سر پھٹول کا جس کا نتیجہ ہماری موجودہ زندگی ہے جس سے ہم خود نالاں ہیں کہیئے کہ یہ مذہب۔ تسکین و عروج کے متلاشیوں کے لئے کس طرح جاذب نگاہ بن جائے۔ آج اسلام کے لئے ایک دنیا بے قرار ہے۔ لیکن یا للعجب! کہ تمام عالم اسلامی میں خدا کا ایک بندہ ایسا نہیں جو اسلام کو اس کے صحیح خط و خال میں دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ مسلمانوں میں جو لوگ مغرب کے کرب و الم اور اس کے اسباب و علل سے واقف ہیں وہ اسلام سے بیگانہ ہیں اور جو مذہب کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں ان بچاروں کو اپنے آپ کی بھی خبر نہیں۔ اس لئے ظہر الفساد فی البر و البحر (خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد ہی فساد ہے) اب جویانِ حقیقت تک اسلام کا پیغام کون پہنچائے! صدیوں کے بعد مبدأ فیض کی کرم گستری سے ایک ایسا مردِ دانا پیدا ہوا تھا جو ایمان و حکمت۔ ذکر و فکر۔ عشق و عقل۔ یعنی مشرق و مغرب کا مقام اتصال تھا۔ لیکن (اے ہماری شوریدہ بختی کہیئے کہ) وہ ابھی مغرب کو اس کے نظامِ تمدن کے انجام و عواقب سے آگاہ ہی کر رہا تھا کہ اسے واپس بلا لیا گیا۔ اُس وقت چونکہ مغرب کے سامنے اس کے نظام کے

اثرات محسوس طور پر بے نقاب نہیں ہوئے تھے اس لئے اس مردِ دانا کی باتوں کو "پرانے زمانے کے پند و نصائح" سمجھ کر ٹال دیا گیا۔ آج جبکہ وہ آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور سارا یورپ بلکہ تمام دنیا) اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ اگر وہ مردِ مومن مفکر اعظم زندہ ہوتے تو وہ اس حیثیت میں تھے کہ مفکرین مغرب کو مخاطب کرکے اسلام کا پیغام دیتے اور وہ سنتے۔ اور سننے کے بعد اس پر غور کرتے۔ انھوں نے آج سے بہت پہلے یورپ کے نام یہ پیغام بھیجا تھا۔ (تر

از من اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

برق را ایں بجگر می زند آں رام کند
عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است

چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری!
عجب ایں است کہ بیمارِ تو بیمار تر است

دانش اندوختۂ دل ز کف انداختۂ
آہ از اں نقد گرانمایہ کہ در باختۂ!

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

دگر است آنکہ برد دانہ افتادہ زخاک
آں کہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگر است

دگر است آنکہ زند سیرِ چمن مثلِ نسیم
آں کہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگر است

دگر است آنسوئے نہ پردہ کشادن نظرے
ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

(نور 2)

سے اتنی بھی امید نہ رکھیں کہ اس دانا کو جو ہنوز۔
لدِ جواں" دیکھ لیں۔ وہ گردِ جو آج ساری دنیا
دارِ اشہبِ دوراں"۔ جسے دیکھنے کے لئے آسمان
بہ شادابی عالم ہو جائے۔ اور ایک بار پھر اس

رگاہ سے یہ نمناک آنکھیں مایوس لوٹ آئیں گی؟
ہے!!

نوجب بنے۔

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم | چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ راکہ باغوشِ زمین است ہنوز | شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم
کوہ را مثلِ پرِ کاہ سبک می یابم | پرِ کاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم
انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک | بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم
خرم آنکس کہ دریں گردِ سوارے بیند | جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند

یہ ہے وہ بصیرت و فراست جو قرآن کریم عبدِ مسلم کو عطا کرتا ہے۔ کس قدر حسرت انگیز ہے یہ تصور کہ اس مردِ حق شناس کو عمر بھر یہ آرزو رہی کہ۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

لیکن آج یورپ کا پورا "جنوں کدۂ فرنگ" مقامِ کبریا کی تلاش میں ہے لیکن وہ مردِ مومن موجود نہیں جو اسے بتا سکے کہ مقامِ کبریا کیا ہے؟

بایں ہمہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ خدائے حی و قیوم کی زندہ و پائندہ کتاب دنیا میں موجود ہے۔ چونکہ یہ کتاب قیامت تک کے لئے نوعِ انسانی کا نصاب ہے اس لئے جس کی کتاب ہے وہ خود اس نورِ بصیرت کو عام کرنے کی تدبیر کردے گا۔ ہمیں تو صرف اتنا افسوس ہے کہ سعادت و خوش بختی کا ایسا نادر موقعہ ہمارے سامنے آیا اور ہم اس سے یوں محروم رہ گئے۔ شاید ہمارے جرائم کی پاداش ایسی ہلکی نہیں کہ اتنی جلدی ختم ہوجائے۔

لیکن ہم لاکھ خطا کار سہی۔ کیا اس کے سحابِ کرم کی گہرباری
آغوشِ زمین میں پیوست ہے۔ اپنی آنکھوں سے "شاخ در شاخ و برو
کے مطلع کو مکدر کئے ہوئے ہے۔ جھٹ جائے اور اس کے اندر سے "وہ"
کی آنکھیں بھی ترس گئی ہیں۔ باہمہ جبروت و ملکوت۔ ہمارے سامنے و
زمین پر آسمان کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھ جائے!
اے وہ کہ جس کی رحمت تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔ کیا تیری
الٰہی تو تو ربّ العلمین ہے

ص۱ وہ مرکزِ ملت جو ہم میں سے ہمارے اوراق کی شیرازہ بندی کا

البیان

اپنے معاصرین کی نظر میں

۱۔ یہ پرچہ اپنے علمی، مذہبی، تاریخی مضامین کے اعتبار سے دیگر جرائد پر فوقیت رکھتا ہے۔ (مسلم)

۲۔ اس کے تمام مضامین خاص نقطہ نظر سے لکھے جاتے ہیں۔ (معارف)

۳۔ "البیان" نے تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کے مقتدر دینی و علمی رسائل کی صف میں جگہ حاصل کر لی ہے (شہباز)

۴۔ یہ رسالہ اس قابل ہے کہ ہمارے نئے پرانے تعلیم یافتہ اس کا مطالعہ کریں (ہمدرد صحت)

۵۔ ایک مذہبی پرچہ میں جو خصوصیات ہونی چاہئیں "البیان" ان سب کا حامل ہے۔ (پیام نسواں)

۶۔ "البیان" ایک عرصے سے حقائق اسلامی کی ترجمانی کر رہا ہے (احسان)

۷۔ "البیان" میں قرآنی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر اعلیٰ معیار کے مضامین شائع ہوتے ہیں (ریاست)

۸۔ جہاں تک قرآن مجید کی مرکزیت کا سوال ہے البیان کے مضامین لوگوں کے لئے ایک تنبیہ کا کام دیتے ہیں۔ مذہبی تحقیقات سے دلچسپی رکھنے والے مسلمانوں کے لئے البیان کا مطالعہ بیدار کن ثابت ہوگا (پیامبر)

۹۔ رسالہ عمدہ ہے (مائدہ)

۱۰۔ رسالے کے آخر میں تفسیر بیان للناس کو بہ اقساط شائع کیا جا رہا ہے (سب رس)

لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت تین روپے سالانہ

نوٹ۔ جو اصحاب سالانہ چندہ کے ساتھ مزید ۹ شامل کر کے للعہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں گے۔ انھیں رسالہ "بلاغ" کے ۲۴ پرانے پرچے اور چھ نہایت عمدہ دینی کتابیں مفت بھیجی جائیں گی۔ اس سارے لٹریچر کا مجموعی حجم ۲ ہزار صفحے ہے۔

ملنے کا پتہ: **منیجر رسالہ "البیان" امرتسر** (پنجاب)

حاجی اسد کا انگریزی ترجمہ بخاری

(منقول از اخبار انقلاب، لاہور۔ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۱ء)

قارئین کو یاد ہوگا مسٹر لیو پولڈ وائس ایک آسٹرین اخبار نویس اور انشاپرداز تھے جنھوں نے آج سے تقریباً پندرہ سال پیشتر مدینہ طیبہ میں اسلام قبول کیا اور آپ کا نام محمد اسد رکھا گیا۔ آپ نے پانچ چھ سال مدینہ طیبہ ہی میں رہ کر زبان عربی اور دینیات اسلامی میں کماحقہ مہارت بہم پہنچائی ایک نجدی خاتون سے شادی کی اور اس کے بعد ہندوستان تشریف لے آئے۔ آپ علم و فضل کے علاوہ خدمتِ دین کا بے پناہ اور مخلصانہ جوش رکھتے تھے۔ آپ نے انگریزی میں ایک کتاب "اسلام چوراہے پر" کے نام سے لکھی۔ جو تعلیم یافتہ اسلامی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی اور علامہ اقبال نے بھی اس کی بہت تعریف فرمائی۔ اس کے بعد حاجی محمد اسد نے بخاری شریف کا انگریزی میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ اور اپنا ایک چھوٹا سا مطبع قائم کر کے اسے خود ہی چھاپنے لگے۔ پہلے یہ کام کشمیر میں ہوتا رہا۔ اس کے بعد وہ اپنے پریس کو لاہور میں لے آئے۔ بخاری شریف کے انگریزی ترجمے کے چار حصے نہایت حسن و خوبی سے شائع بھی ہوئے۔ حضور نظام کی حکومت نے بھی اس کے کچھ نسخے خریدے۔

حاجی اسد کا مصمم ارادہ تھا کہ اپنی قومیت کو بدل کر اپنے آپ کو ہندوستانی تسلیم کرالیں لیکن ابھی یہ مرحلہ طے نہ ہونے پایا تھا کہ جنگ شروع ہوگئی۔ حاجی اسد "غنیم کی قوم کے ایک فرد" قرار دیئے گئے اور احمد نگر میں بند کر دیئے گئے۔ مسلمان معززین نے ان کو رہا کرانے کی انتہائی کوشش کی لیکن حکومت کی مصلحتوں نے اس کی اجازت نہ دی چنانچہ وہ آجکل نظر بند ہیں۔ بلکہ ان کی بیگم صاحبہ بھی ایک ایسے مقام پر نظر بند ہیں جہاں جرمن اور اطالوی اسیران جنگ کی بیویاں محبوس ہیں۔ اب کیفیت یہ ہے کہ حاجی اسد کا پریس جس مکان میں تھا۔ اس کے مالک نے کرائے کا دعوےٰ کر کے ڈگری لے لی چودھری نیاز علی صاحب (دارالاسلام پٹھانکوٹ) نے ایک ہزار روپے سے زیادہ رقم صرف کر کے کرایہ بھی ادا کیا اور پریس کا سارا سامان اپنی تحویل میں لے لیا۔ اب حاجی صاحب کے دوسرے قرض خواہ مثلاً پریس کے کارکن وغیرہ بھی اپنی واجب الادا رقم طلب کر رہے ہیں جن کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں۔ بخاری شریف کے انگریزی ترجمے کے جو چار نمبر شائع ہوئے تھے ان کی کوئی اڑھائی ہزار جلدیں موجود ہیں۔ ان کی اصل قیمت دو روپے آٹھ آنہ فی جلد ہے۔ اور اب کاغذ کی گرانی کی وجہ سے اس کی مالیت میں اضافہ ہو چکا ہے لیکن چودھری نیاز علی صاحب نے فرمایا ہے کہ اب فی جلد دو روپے اور چار جلدوں کے ساڑھے سات روپے قبول کر لئے جائیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ حاجی اسد کا قرضہ اتر جائے۔ اور ان کے صاحبزادے کی تعلیم کا خرچ نکل آئے جو ان دنوں پڑھ رہا ہے۔ ہم انگریزی داں احباب سے نہایت مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان جلدوں کو جلد سے جلد خرید لیں۔ اس سے ہم خرما و ہم ثواب کی برکتیں حاصل ہونگی۔ ایک تو وہ آقائے کائنات صلعم کے ارشادات سے بہرہ اندوز ہونگے۔ دوسرے ایک ایسے مصیبت زدہ نومسلم بھائی کی مشکلات میں تخفیف ہو جائے گی جس نے اپنی زندگی اسلام کی دینی خدمت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ ان جلدوں کے لئے فرمائش بھیجنے کا پتہ یہ ہے۔

چودھری نیاز علی صاحب دارالاسلام جمال پور پٹھانکوٹ

شاہ سید احمد شہیدؒ کی سیرت پر ایک اجمالی نظر

باب دوم

اس مضمون کی پچھلی قسط میں سید صاحبؒ کی زندگی کے ابتدائی دور کا ذکر کیا گیا تھا وہ دور ایک تربیتی دور تھا۔ جس میں زندگی کے اصل مقصد کا پہلو بتدریج ایک واضح شکل پکڑتا گیا۔ تا آنکہ حج کے بعد اس مقصد کی عملی تشکیل کا وقت آ گیا۔ اور سید صاحبؒ نے جماعت کے سامنے وہ پروگرام پیش کر دیا جس کے لئے آپ اسکی تربیت فرما رہے تھے وہ پروگرام کیا تھا؟ سید صاحبؒ پر ان کی فراستِ ایمانی اور تفقہ دینی کے علاوہ تجربہ و مشاہدہ سے یہ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی کہ اسلام کو قوت کی ضرورت ہے چنانچہ سید صاحبؒ کا پروگرام اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ "دین الحق" کو طاقتور بنایا جائے تاکہ یہ دنیا کے ہر غیر فطری نظامِ حیات پر غالب ہو کے رہے۔

سید صاحبؒ نے اس باب میں اپنا نقطہ نظر ایک خط کے دوران میں یوں واضح فرمایا ہے۔

"ہر چند یہ فقیر زمانۂ سابق میں بھی خدا کے فضل سے نیک کام یعنی لوگوں کو اتباع شریعت کی طرف دعوت دینے میں دن رات کوشش و جانفشانی میں مشغول تھا چنانچہ یہ بات اس فقیر کے اکثر احباب پر روشن ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اس فقیر کو چند مخلص مومنین کے ساتھ مہاجرین، صادقین کے زمرہ میں داخل فرمایا خدا کے اس احسان پر شکر ہے لیکن چونکہ زبانی دعوت و تبلیغ بغیر شمشیر و سناں سے جہاد کے مکمل نہیں ہوتی، اس لئے رہنماؤں کے پیشوا اور مبلغوں کے سردار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر میں کفار سے جنگ کرنے کے لئے مامور ہوئے اور دینی شعائر کی عزت، اور شریعت کی سربلندی و ترقی اسی رکن جہاد کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی، اسی بناء پر اس عبادتِ عظمیٰ کی ادائی اور سعادت عالیہ کے حصول کا عزم اسی طرح اس فقیر پر القا کیا گیا ہے کہ اس عظیم المرتبت کام کے انجام دینے میں جان و مال قربان کر دینا اہل و عیال اور برادری کو خیرباد کہنا اور وطن سے ہجرت کر جانا، ناپاک مکھیوں کو ہانکنے اور خس و خاشاک کو دور کرنے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا اور یہ سب کچھ محض اللہ کے لئے ہے اس جذبہ الٰہیہ میں نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسہ کا شائبہ نہیں۔ اگرچہ یہ بات فقیر کے اکثر واقفانِ حال پر ظاہر ہے

لیکن مزید تاکید کے لئے پھر نئے سرے سے کہتا ہوں کہ میں خدائے علام الغیوب کو گواہ بناتا ہوں کہ کفار اور دشمنوں کے ساتھ جو "جذبہ جہاد" فقیر کے دل میں موجزن ہے اس میں رضائے الٰہی اور اعلاء کلمۃ اللہ کے مقصد کے سوا عزت وجاہ مال و دولت شہرت و ناموری، امارت و سلطنت، برادران و معاصرین پر فضیلت و برگزیدگی یا کسی اور چیز کا فاسد خیال ہرگز دخیل نہیں ہے۔ واللہ علیٰ ما نقول وکیل"۔

ہندوستان بلکہ ساری دنیاء اسلام کی حالت آپ کی آنکھوں کے سامنے تھی عام بیدینی، کفر و جہل کا غلبہ شرک و بدعت کا استیلاء، شریعت کا اضمحلال و زوال اسلام کی بے کسی، رسوم و شعائر دین کی بے حرمتی آپ دیکھ رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ محض مواعظ و درس تزکیۂ باطن اور بیعت سلوک سے اس کا علاج نہیں ہو سکتا، اس کے لئے قوت کی ضرورت ہے۔ قرآن ایک ضابطۂ قوانین ہے اور کوئی قانون زندہ نہیں رہ سکتا تاوقتیکہ اس کے پیچھے اسے نافذ کرنے والی قوت موجود نہ ہو۔

آپ شروع ہی سے اس مقصد عظیم کے لئے اپنے کو اور اپنی جماعت کو تیار کر رہے تھے۔ پنجاب میں سکھوں کے مظالم سنکر مقام اور وقت کا سوال بھی جاتا رہا۔ آپ نے سرحد کو اپنا مرکز بنانا چاہا۔ مندرجہ ذیل وجوہ نے اس انتخاب کی اور بھی تائید کی۔

(۱) پنجاب کے مسلمانوں کی امداد جو از روئے شریعت اس وقت تمام مسلمانانِ ہندوستان پر فرض تھی اور جس کے ترک سے وہ گنہگار ہو رہے تھے،

(۲) آزاد جنگ جو قبائل کی موجودگی

(۳) آزاد اسلامی اقوام و سلطنتوں کا قرب

سکھوں کے ماتحت پنجاب کے مسلمانوں کی حالت قابلِ رحم اور مسلمانوں کے لئے حد درجہ شرمناک تھی۔ قرآن اس حالت میں بار بار تمام مسلمانانِ ہند کو مخاطب کرتا تھا

اور تم کو کیا ہوا کہ نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کے واسطے جو مغلوب ہیں مرد اور عورتیں اور بچے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو نکال اس بستی سے جس کے لوگ ظالم ہیں اور ہمارے لئے کر دے اپنے پاس سے کوئی حامی اور ہمارے واسطے کر دے اپنے پاس سے مددگار" (النساء)

سب سے زیادہ حق افغانی مسلمانوں پر اور افغانستان کے آزاد افغانوں پر تھا مگر وہ اپنی خانہ جنگی اور عدم تنظیم اور کچھ مرعوبیت کی وجہ سے خود اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے ماضی قریب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے

محمد عظیم خاں اور **یار محمد خاں** پر حملہ کر کے کشمیر اور پشاور فتح کر لیا اور اپنا باجگذار بنا لیا تھا سرحد کا پورا علاقہ یعنی حکومت لاہور ہی کے تابع تھا۔ اس وقت اسی کی ضرورت تھی کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" یہ سعادت ازل سے پشاور سے راس کماری تک پانچ چھ کروڑ مسلمانوں میں اودھ کے ایک اولوالعزم سید کی قسمت میں تھی جو خود پنجاب سے سینکڑوں میل دور رہتا تھا لیکن سعادت بُعدِ مسافت نہیں دیکھتی۔

حج سے پہلے ہی جہاد کی پوری تیاری ہوتی تھی اور سارا وقت جنگی مشقوں میں صرف ہوتا تھا، یہاں تک کہ طالبین سلوک نے اس باب میں سید صاحبؒ کو ٹوک بھی دیا لیکن آپنے اس مشغولیت میں کمی نہ کی حج کے بعد آپ آخری تیاریاں مکمل کرنے لگے۔ "سوانح احمدی" میں ہے

"مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید اور مولانا عبدالحی صاحب وغیرہ علماء کو واسطے بیان کرنے مضامین ترغیب ہجرت و جہاد کے اطراف ہندوستان میں روانہ کر دیا۔ اس وقت سید صاحبؒ کے مکان پر بجائے مراقبہ و مشاہدہ اور توجہ دہی کے فضیلت ہجرت اور جہاد کا بیان اور تلوار و بندوق کی صفائی اور قواعد و چاندماری اور گھوڑ دوڑ ہوا کرتی تھی۔ اب بجائے صوفی و درویش کے ہر شخص سپاہی بن گیا، تسبیح کے عوض ہاتھ میں تلوار اور فراخ جبہ کی جگہ چست الخالق اور پیچدار سربند لباس ہو گیا۔ جن لوگوں نے آپ کے "العین" کو پہلے بصورت درویشانہ اور اب بلباس و وضعِ سپاہیانہ دیکھا تھا ان کو سخت حیرت تھی ان دنوں میں جو کچھ تحفہ تحائف آپ کے لئے لیکر آتا تو اکثر ہتھیار یا گھوڑے ہوتے تھے انہی دنوں میں شیخ فرزند علی صاحب غازی پور جمنا سے دو نہایت عمدہ گھوڑے اور بہت سی وردی کے کپڑے اور چالیس قرآن مجید تحفے لے کر آئے اور سب سے عجیب تحفہ جو شیخ صاحبؒ موصوف لے کر آئے وہ امجد نام ان کا نوجوان بیٹا تھا جس کو انھوں نے مثل حضرت ابراہیم خلیلؑ اللہ نذر کر کے سید صاحبؒ کے حوالہ کر دیا اور عرض کیا اس کو اپنے ساتھ لیجائیے اور تیغ کفار سے اس کی قربانی کرائیے اس وقت ہر شہر و قصبہ گاؤں برٹش انڈیا میں علانیہ جہاد کرنے کا وعظ ہوتا تھا۔

ہجرت | ہجرت جہاد کا مقدمہ ہے۔ ۱۲۴۱ھ کی ابتدا تھی کہ آپنے وطن کو خدا حافظ کہا اور چالیس برس کے بعد ہمیشہ کے لئے اس سے رخصت ہوئے نواب امیر خاں کی خواہش پر جو اب والئے ریاست تھے مجاہدین کے قافلہ کے ساتھ پہلے ٹونک تشریف لے گئے۔ نواب صاحب نے نیاز مندانہ خدمت برادرانہ محبت اور شاہانہ اکرام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ٹونک سے راجپوتانہ اور مارواڑ کا صحرا قطع کرکے مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے حیدرآباد (سندھ) پہونچے راستہ میں ہزارہا مردوں اور عورتوں نے بیعت کی اور ہر جگہ

آپ کے لئے آنکھیں فرشِ راہ کیں۔

حیدر آباد میں کچھ دنوں آپنے قیام فرمایا پھر وہاں سے شکارپور روانہ ہوئے۔ شکارپور میں حاکم شہر آغا کاظم نے استقبال کیا۔ قافلہ کی تمام ضروریات حکومت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں یہیں آپ نے عید الضحیٰ کی تقریب پر بیس ہزار نمازیوں کی امامت فرمائی۔

یہاں سے آپ مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے **پشین** اور **درّہ بولان** کے راستہ سے قندھار پہونچے جہاں آپ کا پرتپاک استقبال ہوا۔ قندھار سے آپ غزنی گئے اور وہاں کے حاکم میر محمد خاں نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ غزنی سے آپ کابل روانہ ہوئے۔

کابل میں سردار سلطان محمد خاں آپ سے بہت اچھی طرح پیش آیا۔ اس زمانہ میں سردارانِ کابل میں سخت اختلافات تھا اور جنگ کی نوبت پہونچ گئی تھی۔ آپ مصالحت کی امید پر ڈیڑھ مہینہ ٹھہرے رہے جب کامیابی نہ دیکھی تو پشاور روانہ ہوئے۔ پشاور میں تین روز قیام کرکے آپ نوشہرہ آئے اور یہاں قیام فرمایا۔

حکومتِ لاہور کو اعلام نامہ

آپ نے یہاں سے حکومتِ لاہور کو شرعی دستور و حکم کے مطابق یہ اعلام نامہ تحریر فرمایا اور اس طرح آخری حجت تمام کی کہ تین چیزیں ہیں۔

(۱) یا تو اسلام قبول کرو اس وقت ہمارے بھائی اور مساوی ہو جاؤ گے، لیکن اس میں کوئی جبر نہیں

(۲) ہماری اطاعت اختیار کرکے جزیہ دینا قبول کرو، اس وقت ہم اپنی جان و مال کی طرح تمہاری جان و مال کی حفاظت کریں گے۔

(۳) آخری بات یہ ہے کہ اگر تم کو دونوں باتیں منظور نہیں ... تو لڑنے کے لئے تیار ہو۔ مگر یاد رکھو کہ سارا یاغستان اور ملک ہندوستان ہمارے ساتھ ہے اور تم کو شراب کی محبت اتنی نہ ہوگی جتنی کہ ہم کو شہادت کی ہے۔

اس کے جواب میں حکومتِ پنجاب نے سردار ہری سنگھ کو دس ہزار لشکر کے ساتھ مقابلہ کے لئے بھیجا جس نے **اکوڑہ** میں جو **نوشہرہ** سے سات آٹھ کوس ہے اپنا پڑاؤ ڈالا۔

پہلی جنگ

آپ نے جنگ کی تیاری کی۔ لشکر کو ترتیب دی۔ ہر ایک راہِ خدا میں شہید ہونے کی آرزو سے سرشار تھا۔ چنانچہ اس جنگ میں اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ کفار کے سات سو آدمی مارے گئے اور مسلمانوں کے صرف ۷۰ سپاہی شہید ہوئے۔ ان کی سعادت اور شوق شہادت انھیں

کہاں سے کہاں کھینچ کر لایا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون وخاک غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس جنگ کا اثر مسلمانوں اور مخالفین پر خاطر خواہ ہوا، مسلمانوں کے دل بڑھ گئے امیدیں قائم ہوگئیں، دربار لاہور کی بھی آنکھیں کھلیں کہ یہ منہ کا نوالا نہیں ہیں۔

انتظامِ امور کے لئے نیز اس لئے کہ ایک امیر کی قیادت و امامت میں شرعی جہاد ہو۔ علماء لشکر نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ سب سے ضروری یہ ہے کہ پہلے ایک امام مقرر کر لیا جائے۔ چنانچہ ۱۷ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ کو سب نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت امامت و خلافت کی۔ جمعہ میں آپ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ سردار **یار محمد خاں**، **سلطان محمد خاں**، **پیر محمد خاں** حاکمانِ پشاور نے بذریعہ خطوط آپ کی امامت کو قبول کیا۔ ہندوستان میں اس کی اطلاع دی گئی اور علماء ہندوستان نے آپ کی امامت کو تسلیم کیا

امامت امامتِ اسلام کا اہم ترین فرض ہے۔ مسلمانوں کے لئے ایک دن بغیر امام کے زندگی گذارنا معصیت ہے۔ حتےٰ کہ یہاں تک حکم ہے کہ اگر سفر میں تین شخص ہوں تو ایک کو اپنا امیر بنالیں۔ اکابر صحابہؓ نے جو سب سے بڑے فقیہ اور شریعت کے عالم تھے ایک روز کا بھی اس میں توقف نہیں کیا اور باوجود اس کے کہ ان حضراتؓ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چاہنے والا اور زندگی و وفات کے بعد آپ کی حرمت کرنے والا دنیا میں قیامت تک کوئی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اس اہم فریضہ کو آپ کی تجہیز و تکفین پر مقدم رکھا۔ اس جماعتِ مجاہدین (جماعت سید احمد صاحبؒ) کا تفقہ اور توفیق الٰہی اسی سے معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے اس فریضہ کو زندہ کیا اور اپنی اور سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی شرعی اور اسلامی گذارنے کا انتظام کیا۔

بیعت کے بعد سید صاحبؒ نے اطلاع نامے جاری کئے اور تمام علاقہ میں نیز ہندوستان میں اس کی خبر دی۔ ایک والا نامہ کے کچھ حصہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو غالباً سرحد میں کسی مقام کو بھیجا گیا تھا۔

اہلِ انصاف و ہدایت سے پوشیدہ نہیں کہ اہلِ کفر و ضلال کے ساتھ جو جنگ و جدال اور قتل و قتال ہوتا ہے اگر محض مال و عزت اور حکومت و ریاست حاصل کرنے کے لئے ہو تو اللہ کے ہاں اس کا کچھ اعتبار نہیں اور اگر نصرت دین اور اعلاء کلمتہ اللہ اور ترویج

اور ترویج سنتِ نبوی کے لئے ہو تو اس کو عرف شرع میں جہاد کہتے ہیں اور وہ تمام عبادات سے افضل اور تمام طاعات سے اکمل ہے کہ کوئی عبادت رفع درجات اور تکفیر سیئات میں اس کے مساوی نہیں جیسے کہ آیۃ کریمہ فضل اللہ المجاھدین علی القاعدین اجرا عظیما ہ درجات منہ و مغفرۃ و رحمۃ سے معلوم ہوتا ہے پس اس لئے ضروری ہے کہ یہ فرض قانون شرع کے مطابق ادا کیا جائے تاکہ آخرت میں وسیلۂ نجات اور دنیا میں مثمر ثمرات اور نزول رحمت یزدانی اور تائید آسمانی کا باعث ہو جہاد کے لئے سب سے بڑی شرط امام کا مقرر کرنا ہے چنانچہ آیت اطیعوا اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم اور ولو ردوہ الی الرسول و الی اولی الامر منھم.....

نظامِ شرعی کے برکات

امامت کے بعد سید صاحبؒ نے تمام علاقے میں شرعی نظام کے نفوذ کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ نظام شرعی کے برکات بھی جلد ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ شریعت کے احکام جاری ہو گئے۔ مقدمات و تنازعات کا فیصلہ قانونِ شرع کے مطابق ہونے لگا اور شریعت کے سامنے لوگوں کے سر جھک گئے۔ افغانیوں کی عرب جاہلیت کی طرح عادت تھی کہ اگر کوئی شخص حقوق اللہ یا حقوق العباد کا کوئی گناہ کرتا تو دوسرے گاؤں میں چلا جاتا اور وہاں کے رؤسا کی حمایت حاصل کر لیتا وہ اس کی پوری جان و مال سے جانبداری و حمایت کرتے۔ اس طرح کسی جرم کا استیصال اور مجرم کی گوشمالی نہ ہو سکتی۔ لیکن اس نظام کے بعد کوئی کسی کی بے جا حمایت و پاسداری نہیں کر سکتا تھا عبرتناک سزائیں دی جاتیں۔ علانیہ تعزیرات جاری کی جاتیں اور کوئی مداخلت نہ کرتا مثلاً ہنڈ کے علاقہ میں جو خادی خاں (ایک بڑے سردار جنھوں نے سید صاحبؒ کو امام مان لیا تھا) کے زیر حکومت تھا۔ **مانیری** ایک گاؤں تھا جس کے باشندے نہایت سرکش اور شورہ پشت تھے دو ہزار تنفنگچی دیہات میں رہتے تھے اور چھ ہزار اس کے گرد کے گاؤں میں نوے برس ہوئے جب ان لوگوں نے ایک مرتبہ اتفاق کر کے اپنے گاؤں کے رؤسا و زمینداروں کی زمینوں اور املاک پر زبردستی قبضہ کر لیا اور ان کو بے دخل کر دیا۔ ان مظلوموں نے بھاگ کر دوسرے مقامات پر جو **اشرف خاں** کے قبضہ میں تھے پناہ لی اور مدد چاہی۔ وہاں کے لوگوں نے ان کی امداد کی اور اس دیہات پر حملہ کیا، سخت جنگ ہوئی اور بڑا کشت و خون ہوا اس وقت سے دونوں قبیلوں اور ہر دو مقامات کے باشندوں میں عداوت مستحکم اور موروثی ہو گئی اور ہمیشہ جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک صدی گذر گئی اور تین چار ہزار آدمی فریقین کے قتل ہوئے جب نظامِ شرعی کی شہرت و کامیابی ہوئی تو یہ مظلوم سید صاحبؒ کے پاس حاضر ہوئے۔ اور فریاد کی۔ سید صاحبؒ

نے **خادی خاں**، **فتح خاں**، **اشرف خاں** اور دوسرے معززین اور قرب وجوار کے خوانین کو جمع کیا اور معاملہ کی تحقیق کی تفتیش کے بعد انھیں مظلوموں کا حق ثابت ہوا۔ وہاں کے قانون عرفیہ میں سے یہ بھی تھا کہ اگر کسی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ پر قبضہ مخالفانہ ہو جائے اور اس پر کشت وخون بھی ہو تو وہ قبضہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ چونکہ اس جائداد پر ہزاروں آدمیوں کا خون ہو چکا تھا اور بڑی طویل مدت گذر گئی تھی۔ اس لئے اصل مالکوں کا حق منقطع سمجھ لیا گیا تھا آپ نے اصل حقداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی زمینوں پر قابض ہو جائیں اور اپنے باپ دادا کے گھروں میں آباد ہوں۔ اول **مانیری** والوں نے مزاحمت کی اور **خادی خاں** نے ان کی حمایت کی، سید صاحبؒ مع **فتح خاں** و **اشرف خاں** اور ان کے لشکروں کے اور اپنے لشکر و علماء وطلباء کے ان کی تادیب کے لئے آمادۂ اقدام ہوئے علماء نے ان کے مستحل الدم ہونے کا فتویٰ دیا۔ وہ مرعوب ہو کر خود حاضر ہوئے اور مدعیوں کو لیجا کر ان کی زمینوں اور مکانات پر قبضہ دلا دیا اور خود ان کی رعایا بن گئے۔ اس طرح اللہ کے فضل سے وہ قضیہ جو برسوں سے طے نہیں ہوتا تھا۔ اور جس پر ہزاروں آدمیوں کی جانیں گئیں چٹکیوں میں فیصل ہو گیا۔ سارے دیکھنے اور سننے والوں کو سخت حیرت تھی کہ آج تک اس ملک میں ایسا نہ ہوا تھا۔

احتساب کا ایسا اثر ہوا کہ کوسوں تک ڈھونڈے سے کوئی بے نمازی نہیں ملتا تھا۔ لوگوں پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اگر کوئی ہندوستانی یا قندھاری کسی گاؤں میں پہنچتا تو شور مچ جاتا اور وہاں کے رؤسا وحکام باہر نکل آتے اور عرض کرتے کہ یہاں کوئی بے نمازی نہیں ہے۔

منافقین کی سازش اور زہر خورانی

یہ داستان بہت تلخ ہے مگر ہمیں سنانی پڑے گی اس لئے کہ اس کے بغیر یہ تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سکھوں سے چند جھڑپوں اور چھیڑ چھاڑ کے بعد سردارانِ پشاور نے سید صاحبؒ کو **نوشہرہ** آنے کی دعوت دی اور سکھوں کے خلاف ایک منظم اور فیصلہ کن جنگ کا مشورہ ہوا۔ انھوں نے اس موقع پر غیر معمولی طور پر سید صاحبؒ کی تواضع ومدارات کی۔

سیدو کے میدان میں جنگ کی تیاریاں تھیں۔ سردارانِ **پشاور** اور سردارانِ **سمہ** کی فوجوں اور مجاہدین کو ملا کر ایک لاکھ کے قریب لشکر سید صاحبؒ کے زیر قیادت تھا۔ صبح کو فیصلہ کن جنگ ہونے والی تھی صرف ایک رات بیچ تھی اسی رات کو **نذر محمدؓ** اور **ولی محمدؓ** کے ذریعہ سے جو آپ کا کھانا لانے پر مقرر تھے اور **یار محمد خاں** سردارِ پشاور کے ملازم تھے آپ کو کھانے میں زہر ملا ہل دیا گیا۔ آپ نے پورا کھانا کھا لیا، زہر قاتل تھا آپ پر سخت

اثر ہوا۔ صبح دونوں لشکر میدان میں صف آرا ہوئے۔ سردار **یار محمد خاں** نے آپ کی سواری کے لئے قصداً ایک معذور ہاتھی بھیجا۔ صبح مولانا اسماعیل شہیدؒ حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ بے ہوش ہیں اور رتے خود بخود جاری ہے جس سے زہر بتدریج خارج ہو رہا ہے مولانا نے عرض کیا کہ جنگ شروع ہو گئی اور ہاتھی سواری کے لئے در دولت پر حاضر ہے آپ نے اس نازک حالت میں فرمایا کہ مجھ کو سوار کر کے میدان جنگ میں پہنچا دو۔ چنانچہ چند آدمیوں کے سہارے آپ اسی حالت میں سوار ہو کر میدان میں پہونچے۔ صرف چند آدمی آپ کی علالت سے واقف تھے آپ کو دیکھکر مسلمان دلیر ہو گئے اور حملہ شروع ہو گیا۔ سردارانِ **سمہ** اور مسلمانوں کی فوج بڑی بے جگری سے لڑی۔ دائیں سردارانِ پشاور کی فوج بھی بظاہر دامن کوہ پر مسلمانوں کی مدد کے لئے موجود تھی اور بندوقوں اور توپوں کی بھرمار کر رہی تھی مگر بندوق اور توپوں میں بجائے گولیوں اور گولوں کے صرف بارود بھری ہوئی تھی فتح کے آثار نمایاں تھے اور فیصلہ ہونے والا تھا کہ دفعتہً **پشاور** کے لشکر سے دو ڈھائی سو سوار نکل کر سکھوں کے لشکر میں بے روک ٹوک داخل ہوئے۔ اور وہاں کے سپہ سالار سے مل کر اطمینان سے واپس آ گئے۔ اور کچھ دیر سردارانِ **پشاور** سے سرگوشی کی۔ اسی وقت فوراً سردارانِ **پشاور** اپنی فوج اور سامان جنگ لے کر میدانِ جنگ سے علیحدہ ہو گئے اور میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا **سمہ** کے سردار اور ان کی فوج دل شکستہ ہو گئی اور قدم اکھڑ گئے۔ ساری جنگ ہندوستانیوں پر پڑ گئی وہ دل توڑ کر لڑے لیکن غضب یہ ہوا کہ منظم سازش سے دشمن نے اس ہاتھی کو نشانہ بنا لیا جس پر سید صاحبؒ سوار تھے مولانا اسماعیل شہیدؒ نے سید صاحبؒ کو ہاتھی سے اتار کر گھوڑے پر بٹھا لیا اور باہر پہونچا دیا۔ آٹھویں روز آپ کو ہوش آیا۔ آپ نے مولانا شہیدؒ سے جنگ کا حال دریافت کیا۔ مولانا نے پوری روداد سنادی۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ تمام مجاہدین کو ایک جگہ جمع کرو نیز فرمایا کہ یہ مصیبت بھی اپنے کسی گناہ کی شامت تھی اللہ تعالےٰ نے اس کو مغفرت کا ذریعہ بنا دیا۔ یہ حکمت سے خالی نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ جد امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت بھی پوری ہو گئی۔ **نذر محمد** اور **ولی محمد** گرفتار ہوئے۔ علماء نے ان کے قتل کا فتویٰ دیا۔ مگر آپ نے ان کو معاف کیا اور جب لوگ ان کے درپے ہوئے تو ان کو رات کو مخفی طریقہ پر فرار کر دیا۔

اس کے بعد اب مسلمانوں کا مستقل دو حریفوں سے مقابلہ تھا۔ ایک سکھ دوسرے سردارانِ **پشاور** یہ زمانہ غازیوں کے لئے پورے امتحان کا تھا۔ دو زبردست دشمنوں کا مقابلہ، بے خانمانی، فاقہ کشی، سردی کا موسم ملک میں برف پڑ رہی تھی نہ رہنے کو مکان تھا نہ اوڑھنے کو کپڑا، نہ کھانے کا سامان، اکثر چار چار فاقے کرنا کے پڑتے، درختوں کی پتیاں ابال کر نمک ملا کر کھاتے، لیکن جوش ایمانی سے مخمور تھے اور سکینۂ الٰہی سے انکے

دل محمود اپنے کو جنت میں سمجھتے تھے اور اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ نہ شکوہ تھا نہ شکایت۔

ایک فتنہ اب آپ نے **پنجتار** کو اپنا صدر مقام بنایا۔ انہی دنوں دہلی کے ایک مشہور عالم بھی آئے۔ ان کے مزاج میں تیزی بہت زیادہ تھی جنگ کی سختیوں کے عادی نہ تھے چنانچہ ان تکالیف سے تنگ آکر سید صاحبؒ پر اوچھے اعتراضات شروع کئے۔ مثلاً آپ کا باورچی خانہ کیوں الگ ہے؟ سید صاحبؒ نے فرمایا یہ مہمانوں کے واسطے ہے جو روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں اور اس میں صرف وہی چیزیں پکتی ہیں جو مخصوص ہدیہ اور ذاتی ملکیت ہوتی ہیں۔ بیت المال سے اس میں کچھ صرف نہیں ہوتا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ وہ سب تحائف بھی مجاہدین پر برابر تقسیم ہونے چاہئیں۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ بہتر ہے یہ کام میں آپ کے سپرد کرتا ہوں آپ یہ خدمت اپنے ذمہ لیجئے۔ اس پر وہ لاجواب ہو گئے۔ انھوں نے آپ کی امامت میں قدح کرنا شروع کیا سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر آپ کے نزدیک میں اس کے لائق نہیں ہوں تو خدا کے فضل سے آپ سید بھی ہیں، عالم مہاجر اور جامع صفات ہیں۔ اس بارگراں کو آپ قبول کریں میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں آج سے آپ امام اور میں آپ کا تابعدار ہوں مقصود حکام کرنا ہے سرداری نہیں اس پر وہ خاموش ہو گئے مگر انھوں نے اہل لشکر سے کہنا شروع کیا کہ تمہارے اوپر بیوی بچوں والدین کے حقوق ہیں تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ غرضیکہ لشکر میں ایک انتشار پھیلانا شروع کیا۔

اتفاق سے ابن فاروق مولانا اسماعیل شہیدؒ اس وقت موجود نہ تھے اور **سہریہ** گئے ہوئے تھے ورنہ اس کا بہت جلد فیصلہ ہو جاتا۔ آخر محمد حسن صاحب رامپوری نے سید صاحبؒ سے کچھ کہنے کی اجازت چاہی اور نماز کے بعد جب سب لوگ موجود تھے مولوی (محبوب علی) صاحب سے کہا کہ آپ یہاں کے لوگوں کو کس طرح خارج از جہاد سمجھتے ہیں مولوی صاحب نے کہا کہ تم کس سے **جہاد** کر رہے ہو اور کون سا جہاد ہو رہا ہے۔ محمد حسن صاحب نے کہا کہ صرف جنگ کا نام جہاد نہیں۔ جنگ کو **قتال** کہتے ہیں اور وہ کبھی کبھی پیش آتا ہے **جہاد** کے معنی ہیں اعلاء کلمۃ اللہ میں کوشش کرنا۔ یہ مدت دراز تک باقی رہتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ قتال کا نام جہاد رکھا ہے اور ان کوششوں کو جو اعلاء کلمۃ اللہ کے واسطے لوگ کر رہے ہیں عبث قرار دیتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس وقت **جہاد** کا انکار کر کے آپ وطن **دہلی** تشریف لے جائیں اور کسی دن کفار سے مقابلہ اور قتال جس کو آپ **جہاد** کہتے ہیں انہیں پیش آجائے تو کس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر آپ کو اس کی اطلاع دیجائے گی اور آپ کونسی کرامت سے اڑ کر داخل جہاد ہوں گے۔

اس سے اندرونی فتنہ جس کا اندیشہ تھا فرو ہو گیا مگر مولوی صاحبؒ دہلی تشریف لے گئے اور ان کے

کہنے سننے سے جہاد کو نقصان پہونچا اور ہندوستان میں کچھ سستی پیدا ہوگئی۔ لیکن جب میدان سے خطوط گئے اور مولانا اسحاق صاحبؒ اور مولانا یعقوب صاحبؒ نے کوشش کی تو یہ فتنہ ختم ہوا اور خرچ اور قافلوں کی روانگی بدستور جاری ہوگئی۔ اسی زمانہ میں مقام فہر میں مولانا عبدالحی صاحبؒ کی وفات ہوئی۔ شیخ الاسلام کی وفات سے مسلمانوں کو عام اور سید صاحبؒ کو خاص صدمہ ہوا۔

جنگ اتمان زئی سرداران پشاور اب کھلے دشمن تھے اب ان کو میدان میں نکل کر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے میں بھی باک نہ تھا سکھوں کو ان سے بڑی قیمتی امداد حاصل تھی یار محمد خاں وغیرہ نے چار ہزار ورانیوں کی فوج سید صاحبؒ کے مقابلہ کے لئے دریائے سندھ کے پار اتمان زئی میں اکٹھا کر دی مجاہدین مقابلہ کے لئے تیار ہوئے۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ کی حسن تدبیر اور جرأت سے دشمن کی توپوں پر قبضہ ہوگیا اور مخالفین کے قدم اکھڑ گئے۔ دوسرے روز تمام دن لڑائی ہوئی مگر مجاہدین کو کوئی نقصان نہ پہونچا۔ برخلاف اس کے مخالفین کو بڑا نقصان ہوا اس کے بعد دو اور مقابلہ ہوئے جس میں مجاہدین کو کامیابی ہوئی۔

فرانسیسی جنرل کا حملہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ایک جنرل وینٹورا تھا سردار خادی خاں (جو سرداران پشاور کی سازش کے بعد مخالفین میں شامل ہوگیا تھا) کچھ تحائف لے کر اس کے پاس حاضر ہوا اسمہ کے خوانین کی شکایت کی اور مجاہدین پر حملہ کی دعوت دی۔ جنرل نے منظور کرلی اور دس پندرہ ہزار فوج اور توپوں کے ساتھ چڑھائی کی۔ مجاہدین کی تعداد معہ قندھاریوں کے نو سو تھی سید صاحبؒ نے دو پہاڑیوں کے بیچ میں جہاں سے پنجتار میں آنے کا راستہ تھا ایک دیوار بقد رقد آدم تیار کرا کے اس میں مورچے اور برج بنوائے اور مدینہ منورہ کی خندق کی طرح اس دیوار بنانے میں آپ مجاہدین کے ساتھ شریک رہے۔

مولانا اسماعیل صاحب شہیدؒ نے آیت بیعت الرضوان پڑھ کر اس کا بیان فرمایا اور جاں نثاری کی ترغیب دی۔ اسی وقت تمام لوگوں نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ جب تک جان میں جان ہے مقابلہ سے منہ نہ پھیریں گے۔ بیعت کے بعد سید صاحبؒ نے سر برہنہ ہو کر بڑی گریہ وزاری سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی بے چارگی اور کمزوری کا اظہار کیا اور استقامت و نصرت کی دعا کی۔ وینٹورا نے یورش اور جوش دیکھ کر پسپا ہونا شروع کیا۔ غازیوں نے درّہ کی انتہا تک اس کا تعاقب کیا۔ وینٹورا دریائے سندھ عبور کر کے لاہور چلا گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی دی۔

منافقین کی سرکوبی اب پانی سر سے اونچا ہوگیا تھا مخالفین صرف اپنی شرارتوں اور مخالفتوں پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ سکھوں سے سازشیں کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا اسماعیل شہیدؒ ان کی سرکوبی کے لئے مقرر ہوئے۔ آپ نے حسنِ تدبیر اور دلیری سے قلعہ **ہنڈ** پر قبضہ کرلیا اور **خاویخاں** مارا گیا **خاویخاں** کے بھائی **امیر خاں** نے **یار محمد خاں** سے مدد چاہی یار محمد خاں نے مدد کی لیکن وہ بھی مقام **زیدہ** میں بڑی جمعیت کے ساتھ مجاہدین کے ہاتھ سے مارا گیا ادھر امیر خاں کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب مجاہدین کا حریف صرف **سلطان محمد خاں** سردار پشاور باقی رہ گیا۔

درانیوں نے بارہ ہزار لشکر اور بڑے سازوسامان کے ساتھ مجاہدین کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کی۔ ہر درانی جوش وغضب میں ڈوبا ہوا تھا۔ تین ساڑھے تین ہزار مجاہدین نے ان کا مقابلہ کیا اور اپنی پھرتی اور دلیری سے توپوں پر قبضہ کرکے ان کو سخت ہزیمت دی۔ درانیوں کا زبردست جانی ومالی نقصان ہوا۔ مجاہدین کے صرف بیس آدمی شہید ہوئے۔ اس سے درانیوں کی قوت ٹوٹ گئی۔

فتح پشاور اس کے بعد سید صاحبؒ نے بغیر کسی مزاحمت ووقت کے **پشاور** فتح کرلیا۔ اہل شہر نے پرجوش خیر مقدم کیا اور مبارک باد دی۔ سید صاحبؒ نے شہر میں داخل ہوتے ہی امن کی منادی کردی اور ممانعت کردی کہ مجاہدین میں سے کوئی شخص کوئی چیز بلاقیمت نہ لے یا کسی قسم کا جبر وتعدی نہ کرے۔ شہر کی دکانیں کھل گئیں۔ فاحشہ عورتیں اپنے گھروں میں روپوش ہوگئیں، شراب کی بھٹیاں اور مسکرات کی دوکانیں بند ہوگئیں۔ شریعت کے احکام جاری ہوگئے اور تارکین صلوٰۃ پر تعزیر مقرر ہوگئی۔ سید صاحبؒ کے نام کا سکہ جاری ہوگیا۔

سلطان محمد خاں نے ارباب فیض اللہ خاں مہمند کو آپ کی خدمت میں بھیجکر اپنی تقصیر اور غلطیوں کی معافی مانگی اور آئندہ کے لئے توبہ کی اور درخواست کی کہ پشاور اس کے سپرد کردیا جائے۔ وہ اس میں شرعی احکام کے مطابق سید صاحبؒ کی نیابت کرے گا۔ جب **سلطان محمد خاں** نے بار بار بڑی عاجزی اور اصرار سے اس کی درخواست کی اور اللہ کا واسطہ دلایا تو سید صاحبؒ نے فرمایا کہ میں توبہ کا احترام کرتا ہوں اور اللہ کے بھروسہ پر اللہ کا یہ ملک اس کے سپرد کرتا ہوں۔ لوگوں کو اس سے معلوم ہوجائے گا کہ میں سلطنت وریاست کا طالب نہیں ورنہ کوئی فاتح یہ نہ کرتا۔ تمام اہل الرائے اور لشکر مجاہدین کی مرضی اس کے خلاف تھی۔ سید صاحبؒ نے بہت دیر تک **سلطان محمد خاں** کو نصیحتیں کیں اور اجرائے احکام

شرعی کے فوائد اور اہمیت جتائی۔ اور خدا کا خوف دلایا اور حکومت کی سند عطا فرما کر مولانا سید مظہر علی صاحب عظیم آبادی کو قاضی شہر بنا کر اور دوسرے اشخاص کے ذمہ شرعی خدمات سپرد کر کے **پنجتار** واپس ہوئے۔

سردار پشاور کی غدّاری

چند مہینوں تک **پشاور** کا انتظام نظام شرعی کے مطابق ہوتا رہا۔ لیکن اس میں بہت سے لوگوں کا دنیاوی نقصان تھا اور یہ ایثار زیادہ دنوں تک نہیں کر سکتے تھے چنانچہ سب سے پہلے **سلطان محمد خاں** نے سید مظہر علی صاحب عظیم آبادی اور اپنے محسن ارباب **فیض اللہ خاں** کو جنھوں نے پشاور کی حکومت کے لئے سید صاحب سے **سلطان محمد خاں** کی سفارش کی تھی، قتل کیا۔ اور اس کے بعد خفیہ سازش کر کے تمام تحصیلداران عشر کو قتل کرا دیا۔

یہ مظلوم، علم و عمل اور خدا ترسی۔ اتقاء اور اتباع شریعت میں سارے ہندوستان کا انتخاب تھے۔ اس واقعہ **کربلا** کی خبر جب لشکرِ مجاہدین میں پہونچی تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور مجاہدین ہاتھ مل کر رہ گئے۔ سید صاحبؒ کو سخت صدمہ ہوا۔ کثیر التعداد مخلصین کی شہادت، پشاور کا قبضہ سے نکل جانا سردار اور قوم کی غداری ایسے حوادث تھے جنھوں نے آپ کا دل توڑ دیا۔ اس کے بعد سید صاحبؒ نے طے کر لیا کہ یہاں رہ کر کام کرنا کوہ کندن کاہ برآوردن ہے۔ اس کام کے لئے دوسری جگہ تلاش کرنی چاہیئے۔

مرکز کی تبدیلی اور ہجرت

سید صاحبؒ نے کئی وجوہ سے سندھ کو اپنا مرکز بنانا چاہا اور ہجرت کی تیاری کی، آپ نے لوگوں کو جمع کیا، ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا اور نہایت پر اثر طریقہ پر اپنا ارادہ بیان کیا اور ان کو رخصتی کلمات نصیحت فرمائے لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ سب نے عرض کیا کہ ہم آپ کو چھوڑ نہیں سکتے۔ ہماری خدمت و رفاقت قبول فرمائیے سید صاحبؒ نے چند ضروری شرائط کے ساتھ منتخب لوگوں کو رفاقت کی اجازت دی اور ۱۲۴۶ھ ماہ رجب میں آپ نے وہاں سے کوچ فرمایا۔ یہ منظر نہایت حسرتناک اور دلخراش تھا۔

اس لشکر کے ساتھ وہاں کی امن و عافیت اور سلامتی و برکت بھی جدا ہو گئی ان کے ہٹتے ہی سکھوں کا لشکر ان پر ٹوٹ پڑا اور اتنی خون ریزی اور آتشزدگی کی جو کبھی نہ ہوئی تھی۔

اہلِ عبرت نے اس کو آسمانی تعزیر و انتقام سمجھا۔

راستہ میں سکھوں سے چند معرکے پیش آئے، خدا کو منظور تھا کہ شریعت و جمعیت اسلامی اور مسلمانوں کی قسمت و عزت کا یہ خزانہ **بالاکوٹ** میں دفن ہو۔

سیّد صاحبؒ کا آخری خط بالاکوٹ سے

ذیل میں سید صاحبؒ کے اس آخری خط کے ایک حصہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو آپ نے بالاکوٹ سے نواب وزیر الدولہ مرحوم کو ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ یعنی شہادت سے صرف گیارہ روز پہلے لکھا تھا۔

"باقی حال یہ ہے کہ اہل **سمہ** چونکہ بدبخت ازلی تھے انھوں نے جہاد کے بارہ میں مجاہدین کی رفاقت اختیار نہیں کی۔ بلکہ کافروں کے اغوا سے بعض مجاہدین ابرار کو جو بعض ضرورتوں سے اپنے لشکر سے نکل کر گاؤں میں متفرق ہو گئے تھے اور منتشر تھے بے خبری میں شہید کر دیا۔ اگرچہ اصل لشکر ان کے گزند سے محفوظ اور خدمتِ دین کے لئے مستعد خصوصاً ان منافقین کو زیر و زبر کرنے اور ان سرکشوں سے انتقام لینے کا آرزومند تھا لیکن چونکہ وہاں ٹھہرنے سے اصل مقصود یہی تھا کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت مجاہدین کی رفاقت اختیار کر کے کفار کا مقابلہ کرے اور اس چیز کی اب ان سے بالکل توقع نہیں رہی، اس لئے وہاں سے ہجرت کر کے **پکھلی** کے پہاڑوں میں آ گیا ہوں، ان پہاڑوں کے رہنے والے حسن اخلاق سے پیش آئے۔ اور **جہاد** کے بارہ میں انھوں نے پختہ وعدے کئے اور اپنے وطن میں انھوں نے رہنے کے لئے جگہ دی، چنانچہ فی الحال **بالاکوٹ** کے قصبہ میں کہ اس کے درّوں میں سے ایک درّہ میں واقع ہے جمعیت خاطر کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں اور کفاروں کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلہ کے لئے تین چار کوس کے فاصلہ پر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے لیکن چونکہ مقام مذکور نہایت محفوظ ہے، لشکر مخالف خدا کے فضل سے وہاں تک نہیں پہونچ سکتا ہاں اگر مجاہدین خود پیش قدمی کریں اور ان سے نکل کر لڑیں تو جنگ ہو سکتی ہے۔ مجاہدین کا ارادہ ہے کہ دو تین روز میں جنگ کی جائے۔ بارگاہ واہب العطیات سے امید یہی ہے کہ فتح و نصرت کے دروازے کھول دیگا اگر اللہ کے حکم سے تائید ربانی شاملِ حال رہی اور یہ جنگ کامیاب رہی تو انشاء اللہ دریائے جہلم و ملک کشمیر تک مجاہدین کا قبضہ ہو جائے گا۔ دن رات دین کی ترقی اور لشکرِ مجاہدین کی کامرانی کے لئے دعا کرتے رہیں۔ والسلام"

مورخہ ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ

مشہد بالاکوٹ
۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ

راجہ شیر سنگھ نے سب طرف سے اپنی فوجیں اور توپیں ہٹا کر بالاکوٹ میں جمع کر دیں۔ اور بالاکوٹ سے دو کوس پر اپنا لشکر گاہ بنایا لیکن بالاکوٹ ایسی محفوظ جگہ واقع تھا کہ وہاں تک پہنچ آسان نہ تھی۔ وہاں تک جانے کے دو رستے تھے اور وہ سوائے شہر کے خاص خاص دافقوں کے اور کسی کو معلوم نہ تھے۔ سید صاحبؒ نے دونوں ناکوں پر محافظ بٹھا دئے جن کی تعداد ضرورت سے کم تھی۔ مسلمانوں کی بدنصیبی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی شیر سنگھ بالاکوٹ کی تسخیر کو ناممکن سمجھ کر واپس جانے والا تھا کہ محافظین میں سے کسی شخص نے اس کو ہمتانی راستہ کا مفصل حال بتا دیا۔ راجہ نے ایک دن پچھلی رات سے تیاری کر کے دفعتہً اس راستہ کے محافظ دستہ پر حملہ کر کے ناکہ پر قبضہ کر لیا اور سید صاحبؒ کو اطلاع ہوتے ہوتے تمام لشکر پہاڑ پر مور و ملخ کی طرح چھا گیا۔

اس وقت مجاہدین نے اپنی شہادت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی، خوشی سے ہر ایک کا رنگ چمک رہا تھا اور خون جوش پر تھا۔ قائدین نے لشکر کو ترتیب دی۔ مجاہدین اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر لڑے۔

اس معرکہ میں وہ لوگ شہید ہوئے جو ہر حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے موجب خیر و برکت تھے۔ تقدس و تقویٰ اور سنت و شریعت کا وہ عطر جو خدا جانے کتنے دماغوں کے پھولوں سے کھینچا گیا تھا اور جو ساری دنیا کو معطر کر سکتا تھا **بالاکوٹ** کی مٹی میں مل کر رہ گیا لیکن صرف اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اس تاریخ کو مسلمانوں کے اقبال کا ستارہ غروب ہو گیا۔ مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی، حکومت شرعی سینکڑوں برس کے لئے ایک خواب بے تعبیر ہو گئی۔ شرع و دین کا جلال اور اس کا تخت و تاج لٹ گیا اور ہندوستان کی آزادی صدیوں کے لئے بچھڑ گئی۔ **بالاکوٹ** کی زمین چند مذہبی دیوانوں کا ہی مقتل نہیں بلکہ بہت سے سیاسی ہوشمندوں کی بھی عبرت گاہ ہے۔

سید احمد شہیدؒ کی زندگی کے مختصر سے حالات جذب و عشق علم و عمل کا عجب امتزاج۔ لیکن تعجب کیوں؟ مومن کی تو یہی شان ہے کہ دین الحق کو دنیا کی ہر چیز پر غالب کرے! پھر بھی تعجب ہے اس نقطۂ نظر سے کہ ہم آج بھی مسلمان ہیں لیکن کیسے مسلمان کبھی کسی کی تمکنت سے خائف اور کبھی کسی کی دولت سے مرعوب! ہر وقت مغلوب گماں اف جوہر عشق سے عاری ــــ حیوانوں کی سی بے حس زندگی بسر کرنے پر قانع۔ بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر چلتی پھرتی لاشیں!

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ۔۔۔ مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے (اقبالؒ)

نقد و نظر

۱- اقبال کا مطالعہ

حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کی وفات سے لیکر اس وقت تک آپ کی زندگی اور پیغام کے متعلق بہت کچھ شائع ہوا لیکن ہیں ہمیشہ اپنے محترم سید نذیر نیازی صاحب (مدیر طلوع اسلام۔ دور اول) سے گلہ رہا کہ انھوں نے اس باب میں اپنی ذمہ داری کے احساس کا عملی ثبوت نہیں دیا اس لئے کہ حضرت علامہؒ سے سب سے زیادہ قرب انہی کو رہا ہے ان کی زندگی کے آخری دو تین سال میں تو گویا نیازی صاحب مستقلاً فیضیاب رہے۔ بارے الحمد کہ انھیں اب حوادثِ زمانہ نے اتنی فرصت دی ہے کہ وہ اس طرف متوجہ ہوسکیں۔ چنانچہ ان کے چار مضامین کا مجموعہ ہمارے زیر نظر ہے (۱) اقبال کا مطالعہ (۲) اقبال اور حکمائے فرنگ (۳) اقبال کی عظمت فکر اور (۴) اقبال کی آخری علالت (آخری مضمون اس سے پیشتر رسالہ اردو کے اقبال نمبر میں شائع ہو چکا ہے) پہلے تینوں مضامین فلسفۂ اقبال پر فلسفیانہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اکثر دانا دشمنوں اور نادان دوستوں کی طرف سے یہ خیال عام کیا جاتا ہے کہ حضرتِ علامہؒ کے پیغام اور فلسفہ کے مآخذ حکمائے یورپ کے افکار ہیں۔ حالانکہ حضرت علامہؒ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ میرے افکار و تصورات کا سرچشمہ کتاب اللہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ نیازی صاحب نے اس غلط فہمی بلکہ غلط بینی کی فلسفیانہ انداز میں تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ اقبال کو سمجھنے کے لئے کونسے پس منظر کی ضرورت ہے کتاب متوسط تقطیع کے ۱۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ طباعت۔ کتابت کاغذ عمدہ قیمت بلا جلد عہ ملنے کا پتہ۔ کتاب خانہ پنجاب بیرون لوہاری گیٹ لاہور

کتاب کی افادی حیثیت کے علاوہ اس کے جلد فروخت ہو جانے کی ایک ضرورت اور بھی ہے۔ نیازی صاحب کے سامنے اب دوسرا اہم کام اس "ڈائری" کی ترتیب اور اشاعت ہے جس میں حضرت علامہؒ کے وہ ارشادات و تصریحات ہیں جو ابھی تک عام نگاہوں سے مستور ہیں ظاہر ہے کہ یہ چیز کس قدر اہم اور نایاب ہو گی لیکن موجودہ گرانی کے زمانہ میں ایسی کتاب کا شائع کرنا کچھ آسان نہیں۔ اس کتاب کی اشاعت میں آسانی پیدا کرنے کی یہ بھی شکل ہے کہ موجودہ کتاب جلد از جلد نکل جائے۔ یوں بھی اس سے طبائع میں اقبال کو صحیح طور پر سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ ان کے "ارشادات و تصریحات" کے آمادہ ہو جائیں گی

۲۔ سرسیدؒ کے زیر اثر اردو نثر نگاری (انگریزی)

مصنفہ۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم عبداللہ۔ ناشر شیخ محمد اشرف
قیمت مجلد۔/۸/۳ روپیہ

تصنیف کا مقصد بقول مصنّف یہ ہے کہ اردو زبان کے متعلق ایسی کتابیں ابھی تک ناپید ہیں جن میں کسی زمانہ کے ساتھ ساتھ اُس سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو بھی۔ جو ان کارناموں کے محرک ہوں۔ پوری اہمیت دی گئی ہو انیسویں صدی کے مصنفوں کے دل و دماغ پر جو مذہبی۔ سیاسی اور معاشرتی اثرات چھائے ہوئے تھے ان کا نشان کسی کتاب میں بھی نہیں ملتا۔ یہ کتاب مصنف نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی ہے۔ مگر مضمون کی وسعت کے لحاظ سے اپنے آپ کو سرسید اور ان کے رفقاء کی تصانیف تک محدود رکھا ہے اس کے لئے دو وجوہات پیش کی گئی ہیں۔ اول یہ کہ اردو زبان میں مغربی اثرات کو سب سے پہلے سرسید ہی کی بدولت دخل نصیب ہوا۔ دوسرے اس بلند شخصیت کے اثر سے اردو زبان میں طریق بیان اور طرز تخیل کی خوبیاں ہیں کھلیں ان کو ابھی تک پوری اہمیت نہیں دی گئی سرسید اور شبلی پر شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے اور سرسید پر تو اس کی مرکزی حیثیت کی وجہ سے ایک علیحدہ مفصل باب ہے۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے۔ یوں کہیئے کہ انیسویں صدی میں مسلمانوں کے مذہبی۔ سیاسی اور معاشرتی رجحانات کی مختصر مگر جامع تاریخ ہے۔

۳۔ مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر:۔

مرتبہ پروفیسر محمد سرور۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ ناشر کتاب خانہ پنجاب لاہور۔ قیمت مجلد۔/۸/۱ روپیہ

حالات مولانا مرحوم کے اپنے الفاظ میں ہیں۔ کتاب ان کے مختلف مضامین اور خطوط سے مرتب کی گئی ہے مولانا کا پہلا سفر ۱۸۹۸ء میں اور دوسرا ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ یہ دونوں تعلیم کے سلسلہ میں تھے۔ تیسرا سفر ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے سلسلہ میں سید وزیر حسن جو اس وقت مسلم لیگ کے سکریٹری تھے کے ہمراہ کیا ۱۹۲۰ء میں چوتھی بار پھر یورپ گئے اس دفعہ خلافت وفد کے صدر کی حیثیت سے۔ ۱۹۲۸ء کا پانچواں سفر مرحوم کا سفر صحت تھا۔ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ یہ چھٹا اور آخری سفر تھا۔

زیر نظر کتاب میں زیادہ تر حالات پانچویں سفر کے ہیں جو علاج کے سلسلہ میں کیا گیا تھا۔ چھٹے سفر کے سلسلہ میں صرف چند خطوط ہیں جو مرحوم نے اپنی صاحبزادی کو لکھے۔ تیسرے سفر کے حالات "کمریڈ" اور "ہمدرد" سے لئے گئے ہیں۔ باقی سفروں کے متعلق مرحوم نے پانچویں سفر کے حالات میں کہیں کہیں ذکر فرمایا ہے

اور مترجم نے وہاں سے جستہ جستہ عبارتیں لے لی ہیں۔ محمد علی جوہر بھی ظاہر اور باطن میں یکساں ہوتے تھے۔ بخ کے خطوط میں جس طرح ابھر کر سطح پر آسکتے ہیں اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

اضافیت = تصنیف جناب ڈاکٹر ضی الدین صاحب صدیقی۔ پروفیسر ریاضیات۔ جامعہ عثمانیہ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی حجم ۱۶۰ صفحات۔ طباعت۔ کتابت۔ کاغذ عمدہ قیمت بلاجلد ۱۲ مجلد ۱۴

آئین سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی عام فہم تشریح ہے۔ قارئین طلوع اسلام کے لئے ڈاکٹر صاحب کی ہستی محتاج تعارف نہیں۔ بقول مصنف اس کتاب کو میں نے ۱۹۳۸ء کے اوائل میں علامہ اقبالؒ کی خاطر لکھنا شروع کیا تھا مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ وہ نظریۂ اضافیت کے بنیادی اصولوں سے واقف ہو جائیں تاکہ جدید فلسفہ پر اس نظریہ کا جو گہرا اثر ہوا ہے اس کا اندازہ کرسکیں۔ ابھی کتاب کے پہلے تین باب بھی ختم نہیں ہوئے تھے کہ علامہ اقبالؒ کا انتقال ہوگیا"

اس نظریہ کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ لوگوں کے دلوں پر نظریۂ اضافیت کا ڈر بہت چھایا ہوا ہے اور پہلے ہی سے یہ بات ان کے ذہن میں جم گئی ہے کہ اس نظریئے کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ایک افسانہ مشہور ہے کہ دنیا میں صرف دس بارہ ریاضی داں ایسے ہیں جو اس نظریۂ کو سمجھنے کے قابل ہیں۔ یہ محض افسانہ ہی افسانہ ہے۔

کتاب میں حتی الامکان اصطلاحوں، ریاضی کی علامتوں اور ضابطوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔ پوری کتاب میں دو چار ضابطے آگئے ہیں۔ اول تو یہ بہت آسان ہیں جن کو میٹرک کی ابتدائی ریاضی سے واقف شخص بھی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ عام زبان میں ان ضابطوں کا مطلب پوری طرح بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ سمجھ میں نہ آئیں تو ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں۔ نفس مضمون اور استدلال پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ بنیادی تصور ان ضابطوں کے بغیر بھی واضح ہو جاتا ہے"۔

زیر نظر کتاب اضافیت کے نظریۂ سے ہی متعلق ہے۔ اس نظریۂ کے پس منظر اور عمیق فلسفہ سے متعلق مباحث اس سلسلہ کی آئندہ کڑیوں میں آئیں گے۔

عیدالاضحیٰ

جناب پرویز کی وہ تقریر جو نشر گاہِ دہلی سے ۲۹ دسمبر ۱۹۴۱ء کی شام کو نشر ہوئی اور جسے بعد اجازت ڈائرکٹر صاحب شائع کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ تھلگ پڑے ہوں تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے جب ایک نظام کے ماتحت۔ ایک خاص ترتیب سے۔ ایک جگہ جمع کر دئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت، دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہوگی اور اس طرح ان کی اس مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ محسوس شکل میں۔ گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظامِ انسانیت کو عدل پر چلا سکے اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ۔ ضبطِ نفس۔ غیر اللہ کی محکومی سے انکار۔ اللہ کی حاکمیت کا اقرار۔ مرکزیت۔ اجتماعیت۔ اطاعتِ امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں۔ اور بالآخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔

رمضان مبارک کے پورے مہینے کی شق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا۔ دلوں میں تازگیٔ ایمان، نگاہوں میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہو گئی تو عید الفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملت اسلامیہ کی نمایندگی کے لئے بہترین افراد کا انتخاب ہوا۔ مسلم نمایندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں سے جنگل۔ بیابان کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے۔ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن۔ اطاعت کا مرکز امیر اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں

سے وجود میں آیا۔ اور دنیا کے تبکدہ میں خدا کا پہلا گھر کہلایا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ (۳/۹۵) بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کے لئے (بطور مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن اور حفاظت میں آگیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں وہ ان تمام غیر فطری حدبندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے جن سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز۔ رنگ اور زبان کا امتیاز ــــ جغرافیائی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حدبندیاں ہیں۔ اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہونگے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی۔ جاپانی۔ ہندی۔ افغانی۔ ایرانی۔ تورانی۔ حبشی۔ افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہونگے کہ

تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

یہی نہیں بلکہ۔ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ اور ادنےٰ کے امتیاز کی جھلک نمودار ہو سکتی ہے اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا اور حکم دیدیا کہ ارض حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک بن سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ یہ ہے وہ **وردی** جو اسی بین الملی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ یوں باطل کے ہر امتیاز کو مٹاتے۔ وحدت کے رنگ میں رنگے یہ قافلے چاروں طرف سے، اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ سب ایک آقا کے غلام۔ ایک حاکم کے محکوم۔ ایک قانون کے تابع۔ ایک نظام کے پابند۔ فقیرانہ لباس۔ ننگے سر۔ گدایانہ وضع۔ قلندرانہ ادائیں۔ سکندرانہ جلال۔ دنیا بھر کے آستانوں سے بے نیاز، مستانہ وار گذرتے ہوئے **ایک** کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے بیتاب۔ دل و فور شوق سے بیقرار، آنکھیں مئے توحید سے نشہ بار لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے یوں دواں دواں۔ جانب مرکز کھنچے چلے آرہے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں، رنگ و بو کی فضاؤں کے جوہر اپنے سینوں میں بھر کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پروانہ وار اڑتی چلی آرہی ہوں کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ تگ و دو کا ماحصل۔ مرکز میں لاکر اکٹھا کر دیا جائے۔

زمانۂ ابراہیمیؑ میں رواج تھا کہ عہد و پیمان کی پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے۔ جب ان

رہروانِ منزلِ شوق کے قافلے۔ حریم کعبہ میں پہونچے تو اس عہد و پیمان کی تجدید کے لئے جو انھوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے۔ حجرِ اسود کو چھوا۔ بعض نے ہجوم کی وجہ سے دور ہی سے اشارہ کر دیا۔ کسی نے پیمان کے تقدس کی رعایت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی تجدید ہوتی کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

میری نماز۔ میرا حج۔ میرا جینا۔ میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

اس عہد و پیمان کی تجدید سے، وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خدا کے اس گھر کے گرد۔ پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے محو نیاز ہے۔ کوئی اس کا غلاف تھامے عالمِ وارفتگی میں جھولی پھیلائے کھڑا ہے۔ دل میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم۔ آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو۔ لب پر دعائیں۔ محویت کا عالم۔ آسمان سے نور کی بارش۔ رحمتوں کا نزول۔ غرضیکہ ایک نئی دنیا اور ایک عجیب سماں ہے۔

جمخانۂ حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے ۸ تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہو گئے۔ پاک اور صاف، سر سے پاؤں تک للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے۔ قدم وادیٔ مکہ میں۔ نگاہیں عرشِ معلیٰ پر۔ کوئی تیز گام کوئی آہستہ خرام۔ کشاں کشاں۔ ۹ تاریخ کو اس میدان میں آ جمع ہوئے۔ کیا حسین نظارہ ہے۔ سب ایک آقا کے غلام۔ ایک ملت کے فرد ایک ہی وضع۔ ایک ہی انداز۔ بھائی سے بھائی ملا۔ ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا۔ کہ اس مقام کا نام ہی **عرفات** کا میدان ہے، اجتماع کیا ہے؟ مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ جس میں ہر قطرہ، اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے۔ یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے ان کا منتخب **امام** منبرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیا۔ اس نے ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا۔ اور سال بھر کے لئے ایک مرتب شدہ پروگرام کا اعلان کر دیا جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع۔ زندہ آرزوؤں کی ایک نئی دنیا اپنے جلو میں لئے۔ دوسری صبح منیٰ کے میدان میں آ گیا۔ یہی وہ میدان ہے جہاں ملت حنیفہ کے پیشوائے اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا۔ اور یوں اپنے ایمان محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم ہو تو عزیز ترین متاع بھی بلا تامل نثار کر دی جا سکتی ہے۔ اس صحرائی قربانگاہ میں پہونچکر

ملت اسلامیہ کے ان نمایندوں نے اس اقرار کو دہرایا کہ تیرا نام بلند کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اسکی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہوگی۔ بلا دریغ کر دی جائے گی۔ یہاں پہونچکر مختلف ملکوں کے نمایندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے۔ یہ سب اللہ کے مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں آج صبح ہندی مسلمانوں کے ہاں سب کے کھانے کا انتظام ہے شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے۔ ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جارہی ہیں سامان تو کھانے پینے ہی کا ہے۔ لیکن چونکہ وہ مقصد عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصۃً اللہ کے لئے ہے اس لئے یہ دعوتیں بھی دنیا کی دعوتوں سے نرالی ہیں۔

لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۲۲/۳۷) اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہونچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ۔ پاکیزگی مقصد پہونچتی ہے۔ اس نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم اللہ کی راہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو۔ اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔ دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں، دماغی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ ادھر ادھر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے۔ خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (۲/۱۹۸) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) کماؤ۔ اس طرح یہ اجتماع ملت اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد یہی ہے لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں

تین دن تک یہ اجتماع رہا جس میں عالم اسلامی کے ہر گوشے اور ملت اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلۂ خیالات ہوا۔ اُدھر یہ ہو رہا ہے۔ اِدھر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملت کے افراد۔ اپنے اپنے ہاں وادیٔ مکہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عیدگاہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نیز اس پروگرام کو سننے کے لئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدان عرفات میں ہوا ہے۔ اس پروگرام کی اطلاعیں ریڈیو اور تار برقی سے تمام عالم اسلامی تک پہونچ چکی ہیں۔ مقامی مسلمان عیدگاہوں میں پہونچے۔ اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر اب سال بھر عمل کیا جائے گا۔ وہ تھا حج یہ ہے عید۔ وہ فریضۂ مقدس جس میں نوع انسانی کے قیام و بقاء کا راز ہے۔ تمام انسانوں کا

اس لئے کہ مسلمان دنیا میں اپنے ہی لئے نہیں جیتا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے جس سے انسانیت بڑھے۔ پھولے۔ پھلے۔ اور عروج وارتقاء کی منزلیں طے کرکے۔ اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہونچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے۔ جَعَلَ اللّٰہُ الکعبۃ البیت الحرام قیماً للناس (۹۷) ۔ اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے (امن وعافیت کے) قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ——— تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی ——— یہ سب اس لئے کہ جن اصولوں پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے۔ فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رُو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری تصور کرکے انھیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رُو سے **مکہ** کو ھدی للعٰلمین تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو قیاما للناس۔ تمام تمام نوع انسانی کے **قیام** کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جمعیت آدم کا فطری نتیجہ ہے۔ دنیا کا امن وسکون۔ ومن دخلہٗ کان اٰمناً ہ جو اس میں داخل ہوا۔ امن وحفاظت میں آگیا **حج** اور **عید** اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

{ یہ تقریر آپ نے ریڈیو پر سن لی ہوگی۔ نہ سنی ہو تو اب آپ کے سامنے ہے اگر آپ سمجھتے ہوں کہ مسلمانوں کی مختلف تقریبوں پر اس قسم کی تقریریں نشر ہونی چاہئیں جن سے اسلام کی صحیح تعلیم دنیا کے سامنے آسکے۔ تو اس کے متعلق "اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو دہلی" کو خط لکھئے۔ یاد رکھیئے آج کی دنیا میں ریڈیو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسے حتی الامکان صحیح فائدہ حاصل کرنا آپ کے اپنے اختیار میں ہے۔ طلوع اسلام }

در اصل اس سے مقصد یہ ہے کہ اس مصیبت زدہ بھائی کی کچھ مدد ہو سکے۔ جو احباب ان کی کتابوں کو نہ بھی خریدنا چاہیں اور ان کی مدد کرنا چاہیں وہ ویسے ہی کچھ امداد فرما دیں۔ تفصیل اعلان میں ملے گی۔

---

(۵)

ہمیں آنریری سکریٹری اینگلو عربک کالج اینڈ اسکولز سوسائٹی دہلی کی طرف سے ایک اشتہار موصول ہوا ہے جس میں کالج کی نئی عمارت کے لئے پچاس ہزار روپے کی اپیل مسلمانوں سے کی گئی ہے اگر یہ روپیہ فراہم ہو گیا تو اتنی ہی رقم حکومت کی طرف سے بھی مل جائے گی جو حضرات اس میں حصہ لینا چاہیں وہ اپنی امداد کا روپیہ معتمد کے پاس ارسال فرما دیں۔

---

(۶)

کاغذ کی ہوشربا گرانی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

گرانی کے علاوہ کاغذ بازار میں ملتا بھی مشکل سے ہے چنانچہ اس دفعہ صاف کاغذ ملا نہیں اور مجبوراً ردی کاغذ پر رسالہ چھپ رہا ہے۔ اس ردی کاغذ کی قیمت جنگ سے پیشتر صاف کاغذ کی قیمت سے قریب تین گنا زیادہ ہے۔ ان مشکلات کا اندازہ فرمائیے۔

---

(۷)

معارف القرآن کی قسط ثانی کی جو جلد سازی ہوئی تھی اس میں سے بہت تھوڑے نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد جلد کا دام کیا دینا پڑیگا۔ اسلئے جو احباب کتاب خریدنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اسے جلدی منگالیں۔

دورِ حاضرہ کی عظیم الشّان کتاب

"معارف القرآن"

(از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز مدظلہ)

یعنی حقائق قرآنی کا دائرۃ المعارف۔ جو اس اصول پر مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے مکمل اور واحد ضابطۂ حیات ہے۔

اس کی ترتیب

کے متعلق یوں سمجھئے کہ قرآن کریم سے متعلق کوئی مسئلہ آپ کے ذہن میں آئے۔ پوری کی پوری قرآنی تعلیم۔ ایک دلکش۔ مربوط مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے ہو۔

جلد اوّل

شائع ہو چکی ہے۔ بڑی تقطیع ۲۲×۲۹/۸ کے ۵۷۶ صفحات پر مشتمل۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت جلد اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت

بلا جلد ——— پانچ روپیہ ——— محصول ڈاک ۱۳؍

مجلد ——— ساڑھے چھ روپیہ ——— محصول ڈاک عمر

کتاب کا مقدمہ علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کے تبحرِ علمی کا آئینہ دار ہے جس میں علمِ تفسیر پر بالخصوص محققانہ بحث کی گئی ہے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام قرول باغ دہلی

معاملہ کی ضروری باتیں

طلوع اسلام ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالہ ڈاک کیا جاتا ہے

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے آنی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہو جاتا ہے اس مہینے کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع جوابی کارڈ رکھ دیا جاتا ہے۔ جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آنا چاہیئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے اور فی پرچہ ۸؍ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔پی طلب کرنے کے بعد اسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھئے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف **نمبر خریداری** کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) **طلوع اسلام** کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس سے اشتراک عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ واللہ المستعان

(۱۳) نمونے کے پرچے کے لئے ۴؍ کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں

تازہ پرچہ ۸؍

ناظم ادارۂ طلوع اسلام دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office Delhi.